احوالِ غالب

(انتخاب مضامین جریدۂ ''غالب'')

احوالِ غالب

(انتخاب مضامین جریدۂ ''غالب'')

ادارۂ یادگارِ غالب

مطبوعاتِ ادارۂ یادگارِ غالب

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱۔ پرائمری سطح پر تدریس اردو کے مسائل	حرا شبیر	۶۰۰ روپے
۲۔ جمیل الدین عالی کی سفرنامہ نگاری: ایک مطالعہ	غلام فریدہ	۵۰۰ روپے
۳۔ ولی کا تہذیبی مطالعہ	پروفیسر عبدالحق	۳۵۰ روپے
۴۔ فرہنگ قلی قطب شاہ	مرتبہ: ڈاکٹر نثار احمد	۱۰۰۰ روپے
۵۔ آزاد کی حمایت میں	ڈاکٹر ابرار عبدالسلام	۵۰۰ روپے
۶۔ تحقیق: فکری وفنی مباحث	مرتبہ: ڈاکٹر جاوید اقبال	۸۰۰ روپے
۷۔ مکتوبات عبدالعزیز خالد	مرتبہ: ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر	۳۵۰ روپے
۸۔ میرا سفرِ حج	مرتبہ: ڈاکٹر اصغر عباس	۲۰۰ روپے
۹۔ اردو کی غیر افسانوی نثری اصناف	ادارہ	۳۵۰ روپے
۱۰۔ صحتِ املا کے اصول	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۸۰ روپے
۱۱۔ اردو فکشن پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات	ڈاکٹر زینت افشاں	۶۰۰ روپے
۱۲۔ جامعۂ کراچی سے جامعۂ لندن	محمد حمزہ فاروقی	۳۰۰ روپے
۱۳۔ مسافرانِ لندن	سمیع اللہ خان، مرتبہ: اصغر عباس	۳۰۰ روپے
۱۴۔ قصہ عشق افزا نسخۂ علی گڑھ	ڈاکٹر شاداب احسانی	۶۰۰ روپے
۱۵۔ مسافرانِ لندن	سرسید احمد خان، مرتبہ: اصغر عباس	۴۵۰ روپے
۱۶۔ تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی	جعفر تھانیسری، مرتبہ: ایوب قادری	۳۵۰ روپے
۱۷۔ اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل بیگ	۴۰۰ روپے
۱۸۔ اشلوک (بابا فرید کی شاعری کا ترجمہ)	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	۲۵۰ روپے
۱۹۔ جدید فلسفیانہ افکار	قاضی قیصر الاسلام	۴۰۰ روپے

احوالِ غالب

(انتخاب مضامین جریدۂ ''غالبؔ'')

اِدارۂ یادگارِ غالب

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ یادگارِ غالب

شمار: ۱۰۷

اشاعتِ اوّل	:	۲۰۲۳ء
طابع	:	ادارۂ رموز، شریف آباد، کراچی
قیمت	:	۸۰۰ روپے

اکادمی ادبیات پاکستان (اسلام آباد کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی)

☆

ادارۂ یادگارِ غالب و غالب لائبریری

پوسٹ بکس: ۲۲۶۸، ناظم آباد، کراچی۔۷۴۶۰۰

فون: ۳۶۶۸۶۹۹۸

فہرست

اراکین مجلس عاملہ

ادارۂ یادگار غالب، کراچی

معروضات

۱۹۶۸ء میں اپنے قیام سے لے کر آج تک ادارۂ یادگارِ غالب نے اشاعتی سرگرمیوں کو جاری رکھا ہے۔ اس ادارے کے قیام اور اس کے زیرِ انتظام چلنے والی غالب لائبریری نے شہرِ کراچی کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کو بالیدگی اور شعور فراہم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اپنے عہد کے جلیل القدر ادیبوں اور دانشوروں نے جہاں اس ادارے کے قیام میں اہم کردار ادا کیا وہیں پاکستان اور دنیا بھر سے اردو، فارسی اور عربی کے علماء کے علاوہ دانشوروں اور مفکروں نے اپنے پاکستان اور کراچی کے دوروں کے دوران غالب لائبریری کا دورہ بھی ضرور کیا اور الحمدللہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس کے علاوہ علمی و ادبی مذاکرے اور مشاعرے بھی ہوتے رہے ہیں۔

ادارے کی اشاعتی سرگرمیوں کے سلسلے میں اس کے ادبی مجلّے ''غالب'' نے بھی علمی و ادبی دنیا میں بہت پذیرائی حاصل کی۔ اس میں اہم علمی اور تحقیقی موضوعات پر خاصے کے مضامین و مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ان مقالات میں کافی تعداد میں غالب، اس کے فن اور شخصیت پر بھی علمی و تحقیقی مقالات شامل ہیں۔

انھی مقالات میں سے منتخب مضامین پر مشتمل کتاب ''احوالِ غالب'' پیش کی جا رہی ہے۔ قندِ مکرر کے طور پر یہ مقالات دیکھیے اُن کے معیار کا اندازہ مصنفین کے ناموں سے لگائیے۔

جن میں ڈاکٹر آفتاب احمد خان، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر گیان چند، سید قدرت نقوی، ڈاکٹر حنیف نقوی، شان الحق حقی، ڈاکٹر مختار الدین احمد وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر آفتاب احمد خان

غالب اور عہدِ مغلیہ کی ترجمانی

خواجہ الطاف حسین حالی نے ''یادگارِ غالب'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اگرچہ غالب کی زندگی میں کوئی بڑا کام اُن کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر اسی کام نے اُن کی زندگی کو مغلیہ ہندوستان کے دورِ آخر کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔ ''یادگارِ غالب'' اسی مہتم بالشان واقعے کی تشریح اور اسے اہلِ نظر سے تسلیم کرانے کی سب سے پہلی اور اپنے زمانے کے تنقیدی شعور کی حدود میں سب سے اہم کوشش ہے۔ حالی، غالب کے شاگرد تھے اور ان کے سب سے پہلے سوانح نگار بھی مگر مغلیہ بادشاہت کے زوال اور خاتمے کے متعلق غالب کے خیالات کے بارے میں وہ خاموش رہے اور ان کی خاموشی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ حالی کے لیے غالب کی شاعری کی کوئی سیاسی تعبیر پیش کرنا بہت قبل از وقت ہوتا البتہ مولانا غلام رسول مہر نے کہ جنھیں برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ اور سیاست سے بہت گہرا ربط و تعلق تھا، اپنی کتاب ''غالب'' میں داستانِ غدر کے بیان میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ غالب کے اندوہ و ماتم کا سب سے دردناک باب سلطنت تیموریہ کے زوال کا خوں چکاں واقعہ ہے اور غالب کے صریرِ خامہ کی نوائے سروش نوا نہ تھی بلکہ اس بربادی کا نوحہ اور اس تباہی کا مرثیہ تھی۔

بصد احترام عرض کرتا ہوں کہ مہر صاحب کی اس رائے پر ان کے اپنے افکار کی چھاپ کچھ زیادہ گہری ہوگئی ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے ''غالب نامہ'' میں غالب اور وطنیت کی بحث کے دوران غالب کی واقعیت پسندی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے وہ مہر

صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ انھوں نے غالب کی شاعری کسی سیاسی تعبیر سے قطع نظر کرتے ہوئے غالب کو مغلیہ تہذیب و تمدن کا بہترین ترجمان قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ بہادر شاہ سے غالب کی ذاتی وابستگی اور بہادر شاہی دربار سے اُن کے خاندانی تعلقات کبھی اتنے گہرے نہیں ہوئے کہ وہ اس کی بربادی سے بے قرار ہو جاتے۔

اس معاملے میں غالب کے ملے جلے خیالات و جذبات کی جو صراحت خواجہ منظور حسین صاحب نے اپنی کتاب ''تحریک جدوجہد بطور موضوعِ سخن'' میں کی ہے وہ ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اور سب سے زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔ ''دورِ مغلیہ کا زوال اور غالب'' کے باب میں وہ لکھتے ہیں:

غالب اپنے زمانے کی برائے نام مغل بادشاہت کو، جو انگریزوں کے رحم و کرم پر موقوف تھی، کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا بخوبی اندازہ ان اشعار سے ہو جاتا ہے:

اے کاش بتاں کا خنجر سینہ شگاف
پہلوئے حیات سے گزر جاتا صاف
اک تسمہ لگا رہا کہ تا روزے چند
رہیے نہ مشقتِ گدائی سے معاف

گویا ایسے موہوم بے نام و ننگ وجود سے جو:

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کے مصداق ہو، نہ ہونا بہتر، یہی جذبہ فارسی میں یوں ادا کیا ہے:

در تیغ زدن منتِ بسیار نہادند
بُردند سر از دوش و سبک دوش نکسردند
داغِ دلِ ما شعلہ فشاں ماند بہ پیری
ایں شمع شب آخر شد و خاموش نکردند

مغل اقتدار کا ٹمٹماتا ہوا دیا، جس کا حالی کے بقول سارا تیل جل چکا تھا، ان کے خیال

میں اسی سلوک کا مستحق تھا کہ اسے پھونک مار کر گل کر دیا جائے:

بہ ہجراں زیستن کفراست ،خونم را دیت نبود
چراغ صبح گاہی ،آشکارم می تواں کشتن

مغلوں کے زوال کے بارے میں غالب نے ایک جگہ لکھا ہے:

فرماں روا نہ گشت مسلماں بہ ہیچ قصر
مغ رفت گر زِمے کدہ ، ترسا فرو گرفت

گویا فرماں روائی ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تو کیا ہوا؟ ایک تو تاریخی عمل کا تقاضا یہی ہے کہ:

سلطنت دست بدست آئی ہے

دوسرے بعد کے مغل آخر کون سے ایسے مسلمان ،یعنی ''روشن دین و دانش'' اور ''رہ ورسم کارسازی'' پر کاربند تھے؟ یہ نہیں کہ غالب کو زوال وانحطاط کا احساس اور قلق نہ تھا۔اس کے شعور سے تو ان کا کلام لبریز ہے:

دل بہ بہ بے رونقیِ مہر درخشانم سوخت

فتیلۂ رگِ جاں سربسر گداختہ شُد
زپیچ وتاب نفس ہائے آتشیں پیداست

☆☆☆

سوخت آتش کدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانہ ز ناقوس فغانم دادند
ہرچہ از دست گہِ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

☆☆☆

در گردِ غربت آئنہ دارِ خودیم ما
یعنی زِ بے کسانِ دیارِ خودیم ما
ہر کس خبر ز حوصلۂ خویش می دہد
بدمستیٔ حریف و خمارِ خودیم ما
دیگر ز ساز بے خودی ماصدا مجوے
آوازے از گسستنِ تارِ خودیم ما

مگر اپنے تاریخی شعور کی بدولت وہ محض کڑھ کر ہی نہیں رہ جاتے تھے بلکہ اپنے تیرہ وتار زمانے کے بعد ایک تابناک دور کا خواب بھی دیکھتے تھے اور اس کی بشارت بھی دیتے تھے:

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

شمع بجھنے پر جو سورج نکلا وہ سورج روشنی کے ساتھ جھلسا دینے والی تمازت بھی لایا،مگر غالب کے ایک کھوکھلے نظامِ زندگی سے چھٹکارا پانے کی خاطر اس کے لیے بھی تیار تھے کہ ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے:

خوشا کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد
اگرچہ خود ہمہ بر فرقِ من فرد ریزد

یہ صورت ان کی زندگی ہی میں پیش آ گئی اور اس کی خوں چکاں روداد انھوں نے اپنے خطوں میں بڑی دردمندی سے قلم بند کی۔

مغلیہ بادشاہت کے بارے میں غالب کے خیالات کی اس بحث کے بعد اب ہم اکرام صاحب کی اس رائے کی طرف لوٹتے ہیں جس کے مطابق غالب کو مغلیہ تہذیب وتمدن کا بہترین ترجمان قرار دیا گیا ہے۔اکرام صاحب کے خیال میں شاہ جہاں کا تاج محل اور غالب کی شاعری فن کے دو مختلف اصناف کے شاہکار ہیں لیکن دونوں کی تہ میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ اکرام صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ بظاہر تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو مغلیہ

آئین پر آئین فرنگ کو ترجیح دے وہ مغلیہ تہذیب وتمدن کی صحیح طور پر ترجمانی کر سکے لیکن حقیقتاً اس میں کوئی بوالعجبی نہیں۔ غالب دور بہادر شاہی کے مغل تمدن کے مداح نہ تھے لیکن وہ بنیادی مغل روایات کے کامیاب ترجمان تھے۔ یعنی جو اصول اور روایات مغل کیریکٹر، مغلیہ طرز حکومت، مغلیہ فنونِ لطیفہ کی امتیازی خصوصیات ہیں وہی غالب کی شاعری اور زندگی میں نمایاں ہیں اور شاید ان جذبات کا اس سے بڑھ کر ادبی اظہار اور کہیں نہیں ہوا۔ اس تمہید کے بعد اکرام صاحب نے غالب کی زندگی اور شاعری کی ان چیدہ چیدہ صفات کا جائزہ لیا ہے جو اُن کے خیال میں مغلوں کی نسلی صفات کی عکاسی کرتی ہیں۔ صراحتاً انھوں نے ''درع ما کدر خذ ما صفا'' کے اصول، نفاست پسندی او رخوش معاشی، ہموار طبعی، رواداری، اولوالعزمی اور بلند نظری، غم کے مقابلے میں عالی حوصلگی وغیرہ کی نشان دہی کی ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی متفرق تحریروں میں بھی غالب کے بارے میں کچھ اس قسم کے اشارے ملتے ہیں۔ انہوں نے تہذیب وتمدن کے خارجی مظاہر خصوصاً مغل مصوری اور غالب کے اشعار میں صنعت کاری کے درمیان ایک مماثلت دکھائی ہے اور اس لحاظ سے نسبتاً ایک زیادہ واضح تنقیدی رائے کا اظہار کیا ہے۔

مالک رام صاحب نے اپنی کتاب ''ذکرِ غالب'' میں اس باب میں کوئی مستقل بحث نہیں کی عموماً اکرام ہی کے نقطۂ نظر کو اپنایا ہے۔ ان کے نزدیک غالب کی فطرت مغلوں کے بیشتر خصائص کی حامل تھی البتہ ان خصائص کی جو فہرست انھوں نے مرتب کی ہے یعنی دوستوں سے وفا پرستی، عیش وعشرت سے دل چسپی، مذہب سے اوپری عقیدت اور آزادہ روی، دشمنی اور مخالفت میں ضد، انجام سے بے پروائی وغیرہ وہ اکرام کی فہرست سے مختلف ہے۔

غالب کی قوم ونسل سے ہمارے نقادوں کی اس دل چسپی اور شغف کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ مغلوں کے زمانے میں مسلمان معاشرے میں سید، شیخ، مغل، پٹھان کی تقسیم رواج پا گئی تھی۔ اکثر شرفاء، امراء کے خاندان چونکہ بیرون ملک یعنی اس زمانے کی ولایت، وسط ایشیا سے آئے تھے لہٰذا انھیں اندرون ملک اپنا اصلی تشخص برقرار رکھنے پر بہت اصرار تھا۔ چنانچہ ہمارے پرانے

شاعر انھی چار قوموں میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ہمارے پرانے تذکرہ نگار شعراء کے سلسلۂ نسب ان کے آباؤ اجداد کے وطن مالوف اور برصغیر میں اُن کے وارد ہونے کی تاریخ وغیرہ کا ذکر بہت ضروری سمجھتے تھے۔ حالی، مہر، اکرام اور مالک رام نے اسی دستور کے مطابق غالب کے بارے میں یہ تفصیلات فراہم کی ہیں مگر ہمارے پرانے تذکرہ نگاروں نے اس قسم کی تفصیلات کبھی کسی شاعر کا شاعرانہ مرتبہ اور قدر وقیمت متعین کرنے میں کسی استدلال کی بنیاد نہیں بنایا۔ حالی ومہر نے بھی غالب کے سلسلے میں یہ نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکرام صاحب اور پھر کسی حد تک مالک رام صاحب نے جس طرح غالب کی زندگی اور شاعری میں غالب کی نسلی خصوصیات کا کھوج لگایا ہے وہ اس لحاظ سے غیر معمولی ہے کہ اردو کے کسی شاعر کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ خود ہمارے زمانے میں اقبال کی زندگی شاعری اور فلسفے پر بے شمار تبصرے لکھے گئے ہیں مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اکرام سمیت کسی مبصر نے اقبال کی برہمن زادگی کو موضوع گفتگو بنایا ہو حالانکہ خود اقبال کو اس پر بڑا ناز تھا اور انھوں نے بار ہا اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

ادبی روایات کی بنا پر تو شعرا کی تخصیص ہمیشہ ہوتی رہی ہے جیسے انگریزی میں کلاسیکی اور رومانی یا ہمارے ہاں جذباتی فضا اور نفسیاتی رجحان کی رعایت سے میر وسودا کو آہ اور واہ، یعنی غم انگیز اور نشاط آمیز شاعری کا نمائندہ کہا گیا ہے۔ اگر چہ اس قسم کی تخصیص بھی ہر شاعر کے سلسلے میں ٹھیک نہیں بیٹھتی مگر اتنا تو ہے کہ اس سے ایک واضح تصور ذہن میں آتا ہے اور اس لحاظ سے اسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ شعراء کی نسلی تخصیص سے تو معاملہ اور الجھ جاتا ہے اور ادبی تنقید کا کوئی مقصد حل نہیں ہوتا۔ نسلی خصائص کی گنتی میں بہر حال اختلاف کی گنجائش رہتی ہے جیسا کہ اکرام صاحب اور مالک رام صاحب کی بنائی ہوئی فہرستوں سے ظاہر ہے۔

یہ تو خیر ایک ضمنی بحث تھی۔ اس مضمون کا موضوع دراصل یہ ہے کہ غالب کی شاعری اور انشا پردازی کو مغلیہ ہندوستان کے آخری دور کی تہذیب وتمدن سے جو گہرا تعلق تھا اس میں تو کلام نہیں مگر سوال یہ ہے کہ وہ کن معنوں اور کس حد تک اس تہذیب وتمدن کی ترجمانی کا حق ادا کرتی ہے۔ یہاں پھر کچھ تاریخی واقعات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ مغلوں کے عروج کے دوران یعنی

اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں وسط ایشیا، ایران و توران کے علاقوں سے ہر قسم کے افراد مسلسل برصغیر میں وارد ہوتے رہے۔ ان افراد کی ایک معتدبہ تعداد معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور انھیں مغل بادشاہوں کی سرپرستی اور داد و دہش کی کشش گنگا اور جمنا کی وادیوں میں کھینچ لائی تھی۔ ان میں اہل حکومت بھی تھے اور اہلِ حکمت بھی۔ اہلِ تدبیر بھی اور اہلِ سیف بھی، اہل علم و فضل بھی اور اہلِ قلم بھی۔ ان میں سے اکثر کو سرکاری دربار تک رسائی حاصل تھی۔ براہِ راست دربار سے وابستہ تھے یا وابستگاں دربار سے متعلق۔ غرض یہ مغلیہ سلطنت کے ستون تھے۔ ان کے معاشرتی آداب و انداز پُر وقار سمجھے جاتے تھے۔ ان کا ایسا رعب اور دبدبہ تھا کہ جس کے سامنے اس سرزمین کے اپنے معاشرتی آداب و انداز بالکل ماند پڑ گئے تھے۔ فارسی ادب و شعر کا طوطی بولتا تھا۔ کیونکہ فارسی سرکار و دربار ہی کی نہیں اس اونچے طبقے کی زبان بھی تھی۔

غالب خود ترکان ایبک سے تھے اور اسی اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ اگرچہ ان کا خاندان بہت بعد کی کھیپ میں یعنی اٹھارویں صدی کے پہلے نصف کے دوران سمرقند سے ہندوستان آیا تھا۔ غالب کو اپنی خاندانی وجاہت پر بڑا ناز تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پیشۂ آبا سپہ گری کے مقابلے میں شاعری کو ذریعۂ عزت بھی نہیں سمجھتے تھے۔ شاعری بھی انھوں نے زیادہ تر اپنی آبائی زبان یعنی فارسی میں کی جو مغلوں کے زمانے میں اونچے طبقے کی ثقافتی زبان تھی۔ غالب کا وہ مجموعہ اردو جسے ہم حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ خود غالب کی نظر میں کمزور درجے کی چیز تھا۔

۱۔ نیست نقصان یک دو جزاست ار سوادِ ریختہ
۲۔ کاں دژم برگے ز نخلستان فرہنگ من است
۳۔ فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
۴۔ بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
۵۔ فارسی بیں تا بہ بنی کاندر اقلیم خیال
۶۔ مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارتنگِ من است

واقعہ یہ ہے کہ غالب اپنے آپ کو اولاً فارسی شاعر سمجھتے تھے اور بقول حالی اردو میں شعر کہنا اپنی کسرشان جانتے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اب فارسی شعر و شاعری کے جاہ و جلال کا زمانہ گزر چکا ہے۔ یہاں تک کہ فارسی سے ذوق رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی اور وہ ایک محدود ثقافتی اقلیت کے افراد بن کر رہ گئے تھے چنانچہ غالب کو کس حسرت سے کہنا پڑا:

بیا ورید گرایں جا بُوَد زباں دانے
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

غالب کے سر برآوردہ ہم عصروں میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی امام بخش صہبائی وغیرہ اسی قبیل کے بزرگ تھے۔ مولانا فضل حق سے تو غالب کی گہری دوستی تھی۔ ان کا معاملہ جدا ہے۔ آزردہ اور صہبائی فارسی کے نامور سخن سنج اور سخن فہم تھے۔ غالب کا ان سے ربط ضبط ہم عصر اردو شعراء کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ وہ انھی سے اپنے کلام کی داد چاہتے تھے۔ آزردہ، غالب کے کچھ بہت زیادہ قائل نہ تھے۔ چنانچہ حالی نے روایت کی ہے کہ نواب مصطفےٰ خاں کے ہاں ایک محفل میں غالب نے آزردہ کو خاص طور پر مخاطب کر کے ایسے دردناک انداز میں یہ شعر پڑھا کہ حاضرین میں سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا:

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

صہبائی نے غالب اور آزردہ کو ذیل کے مقطع میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

چو دیدم غالب و آرزدہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید

مہر صاحب نے غالب کے فارسی مکاتیب کے حوالے سے چند مشاعروں کا ذکر کیا ہے:

پہلا مشاعرہ: ''وہاں پہنچ کر مولانا صدرالدین آزردہ کی زیارت سے رنج راہ کی تلافی ہوگئی۔ صہبائی نے طرحی زمین میں یہ غزل پڑھی دو تین شعر دل نشین تھے۔''

دوسرا مشاعرہ: ''اردو کے بہت شاعر جمع تھے اور انھوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔

مفتی صدرالدین آرزدہ بیمار تھے۔اس لیے شریک نہ ہو سکے۔''

تیسرا مشاعرہ:''نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بہ سبب علالت نہ آ سکے حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا وہ اگر چہ دیر سے آئے مگر آ گئے۔ میں نے طرحی زمین میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اُسے ''برات نا مقبول'' کی طرح ناخواندہ واپس لے جاؤں اور اردو کے شعرا کو دردِ سر نہ دوں لیکن حضرت آزردہ کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہو گیا اور میں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا۔''

چوتھا مشاعرہ:''اس میں میری ''خاک زمین گیر'' ریختہ گویوں کی آنکھوں کا غبار نہ بنی۔میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی۔ جسے حضرت آزردہ کی خدمت میں بھیج دیا۔''

پانچواں مشاعرہ وہ تھا کہ جس میں غالب ذوق سے ہم طرح ہو گئے تھے (بیاں کے لیے۔زباں کے لیے) اس سلسلے میں لکھا ہے:''اپنی غزل دس شعر کی پڑھی۔میرزا حاجی شہرت نے کم وبیش ستر شعر زمین طرحی میں سنائے۔ میں ایک بہانے سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا.....صبح قلعہ میں گیا.....وہیں سنا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔سب سے آخر میں سلطان شعراء (ذوق) نے دو غیر طرحی غزلیں سنائی تھیں۔''

چھٹا مشاعرہ:''شہزادہ گانِ تیموریہ میں سے ایک نے بزمِ سخن آراستہ کی اور شعراء کو بلایا۔ مجھے ریختہ گوئی سے کوئی ربط نہیں رہا لیکن جانا ضروری تھا۔شب کو مشاعرہ تھا۔دن کے وقت بالخصوص مشاعرہ گاہ میں جاتے وقت بے تکلف چند شعر خیال میں آئے۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اردو شاعروں کا ذکر غالب کس مغائرت آمیز لہجے اور کس دل گرفتگی کے ساتھ کرتے ہیں۔اصل میں ان کی طبیعت اسی وقت آسودہ ہوتی ہے جب محفل میں فارسی دان موجود ہوں۔

یوں تو غالب اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے مگر ادبی اور ثقافتی اعتبار سے وہ بہ نسبت اردو شعرا کی روایت کے برصغیر کے فارسی شعرا کی روایت سے زیادہ گہرا ادبی تعلق رکھتے تھے۔ وہ عرفی ونظیری، فیضی، طالب، ظہوری اور بیدل سے جو ذہنی قربت محسوس کرتے تھے وہ میر

وسودا سے نہیں۔ غالب نے انھی شعرا کی آواز سے اپنی آواز ملائی ہے، اب یہ اور بات ہے کہ ان شعرا کے لب ولہجہ میں مغلیہ عہد کے عروج کی خود اعتمادی، شان وشوکت، طنطنہ اور پرشکوہ ہے۔مگر غالب تو اس گزرے ہوئے طوفان کا وہ آخری بادل تھے جو بدقسمتی سے دو ایک صدیوں کے بعد اس وقت نمودار ہوا جب کہ زمین وآسمان اپنا رنگ بدل چکے تھے۔دورِ حیات ایک نئی کروٹ لے چکا تھا۔ چنانچہ غالب کی قسمت میں اسی سلطنت کو صفحۂ ہستی سے مٹتے ہوئے دیکھنا بھی لکھا تھا جس کے عروج کی ثقافت کی وہ اس کے زوال کے عہد میں پاسبانی کر رہے تھے۔

انقلابِ زمانہ کے اس جاں گداز احساس نے، کہ غالب کے ''آشوبِ آگہی'' کا ایک عنوان یہ بھی تھا، غالب کی زندگی اور شاعری میں ایک خاص قسم کی Tension ''یا کشاکشِ غمِ نہاں'' کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ غالب کے شاگرد اور پہلے سوانح نگار حالی کو اس طرفہ کیفیت کا شدید احساس تھا۔انھوں نے صاف لکھا ہے کہ غالب کی قدر جیسی کہ چاہیے یا اکبر کرتا یا جہانگیر وشاہ جہاں، مطلب یہ ہے کہ غالب دراصل اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد کے لیے پیدا کیے گئے تھے مگر افسوس کہ بہادر شاہ ظفر کے عہد کے حوالے کر دیے گئے۔مگر پھر حالی یہ کہہ کر آنسو پونچھ لیتے ہیں کہ اس عہد میں بھی چند ایسے اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے کہ جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبر وشاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے تھے۔علی الخصوص غالب جن کی عظمت وشان اس سے بالاتر تھی کہ ان کو بارھویں یا تیرھویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں میں شمار کیا جائے۔ چنانچہ حالی نے یادگارِ غالب میں اگر چہ غالب کی اردو شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے مگر فارسی شاعری پر تبصرے کے دوران انھوں نے غالب کا نظیری اور ظہوری سے موازنہ کرتے ہوئے غالب کی بڑائی ثابت کی ہے۔

فارسی شعر وادب کی بالادستی کم وبیش اورنگ زیب کے عہد تک قائم رہی۔اس کے بعد جب سلطنت کا زوال شروع ہوا تو اُس زبان یعنی اردو کا چرچا ہونے لگا جو فارسی اور برصغیر کی مقامی زبانوں برج بھاشا، کھڑی بولی وغیرہ کی آمیزش سے پیدا ہوئی تھی۔اردو چونکہ شہروں کے متوسط طبقے کی بول چال کی زبان کی حیثیت سے اُبھری تھی۔لہٰذا اس کا دائرہ اثر فارسی سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔

وہ سرکار دربار کی زبان نہ سہی مگر بازار اور لشکر خانقاہ اور شہر کے تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کی زبان تو
تھی۔ رفتہ رفتہ وہ شاعری کی زبان بن گئی اور جب بڑے بڑے باکمال شعرانے اسے اپنالیا تو
معاشرے میں اس کا مرتبہ اور وقار بڑھ گیا۔ مختصر یہ کہ اردو نے مغلیہ عہد کے زوال میں عروج پایا۔
شہروں کے متوسط طبقے نے تو اس کی نشوونما اور ترقی میں حصہ لیا ہی تھا آخر کو سرکاری زبان نہ ہونے
کے باوجود دہلی اور لکھنؤ کے درباروں کی سرپرستی بھی اسے حاصل ہوگئی۔

یہ متوسط طبقہ مغل سلطنت میں کیا حیثیت رکھتا تھا یہ بحث الگ ہے۔ میں فقط اس کی
ثقافتی اہمیت پر زور دینا چاہتا ہوں اور اس امر واقعہ پر کہ اس طبقے کی معاشرت بھی مغلیہ عہد ہی کی
تہذیب وتمدن کا ایک حصہ تھی، فرق صرف یہ تھا کہ اس معاشرے میں اونچے طبقے کی فارسی
معاشرت کے اثرات کے ساتھ ساتھ مقامی اثرات یعنی برصغیر کی سرزمین کے بسنے والوں کے رسم
ورواج، طرزفکر واحساس اور انداز وآداب —— مختصر یہ کہ یہاں کی مٹی کی بُو باس بھی پائی جاتی
تھی۔ اردو اسی ملی جلی معاشرت اسی ثقافتی امتزاج کی سب سے حسین یادگار ہے۔ اردو کے تمام
قدیم شاعر ولؔی سے لے کر ذوقؔ تک اسی متوسط طبقے کی معاشرت کی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ اسی کی
پیداوار تھے اور اسی سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں فارسی اثرات موجود ہیں مگر ان
کے مزاج کی ساخت اور دل ودماغ کے تاروپود میں مقامیت کو جو رنگ ملتا ہے وہ غالب کے ہاں
نسبتاً کم ہے۔

میر تقی میر ہوں کہ مرزا رفیع سودا، شیخ مصحفی ہوں کہ سید انشا، خواجہ آتش ہوں کہ شیخ
ناسخ، حکیم مومن خاں مومن ہوں کہ شیخ ابراہیم ذوق، سب کے آبا وَ اجداد کسی نہ کسی وقت بیرون
ملک ہی سے آئے تھے لیکن انھوں نے یہاں کے متوسط طبقے کی زندگی اور معاشرت اس کی زبان او
رثقافتی اقدار کو اس حد تک اپنالیا تھا کہ ان کی شاعری خاص یہاں کی چیز بن گئی تھی۔ ان سب
شعرائے نے بھی فارسی میں شعر کہے ہیں۔ یہ اس زمانے کا عام دستور تھا مگر اصلاً وہ اپنے آپ کو
اردو ہی کا شاعر سمجھتے تھے اور اسی پر ناز کرتے تھے۔ وہ لاکھ ایران، توران کی بات کریں شعر وہ دلی
اور لکھنؤ میں بیٹھ کر لکھتے تھے۔ غالب کے اپنے زمانے میں اگر غالب کے مقابلے میں ذوق کو زیادہ

پسند کیا گیا تو اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ ذوق اس زمانے کے متوسط طبقے کی معاشرت سے
زیادہ قریبی تعلقات رکھتے تھے اور اس کے زیادہ صحیح ترجمان تھے۔ ذوق کی شاعری میں اسی طبقے
کی معاشرت، اعتقادات اور حسیات اور اسی کے اخلاقی رجحانات اور نفسیاتی کیفیتوں کا عکس
دکھائی دیتا ہے۔ اسی بنا پر فراق صاحب نے ذوق پر اپنے مضمون میں ذوق کو ''پنچایتی خیالات یا
رائے عامہ کا شاعر'' قرار دیا ہے۔ آج آپ ذوق کے بارے میں کچھ ہی کہیے مگر آخر کوئی بات
تو تھی کہ ایک معمولی سپاہی زادہ کہ جس کی ساری عمر مفلسی میں گزری، محض اپنی شاعری کے بل
بوتے پر کہاں سے کہاں پہنچا۔ قبولِ عام کی سند بھی پائی اور بادشاہ کی استادی کا منصب بھی حاصل
کیا۔

عام طور پر اردو شعرا خصوصیت سے دلّی کے شعرا میں داخلیت کا رجحان زیادہ قوی ہے
مگر سودا کے ہاں خارجیت کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ اس رنگ کو انشا نے اور فروغ دیا۔ ان کی
شاعری میں جا بجا آس پاس کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا
جائے تو یہ دونوں شاعر نظیر اکبرآبادی کے پیش رو تھے۔ مگر میاں نظیر اپنے مقامی پن بلکہ عوامی پن
میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ ''شرفا'' کے لکھے ہوئے تذکروں میں مناسب جگہ تک نہ پا سکے۔

یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اردو شاعری میں فارسی شاعری کے نشانات وعلامات گل
وبلبل، صیاد وقفس، شمع وپروانہ وغیرہ کے استعمال کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ غور
کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اردو شاعری محض فارسی شاعری کا چربا نہیں۔ فارسی شاعری کا اثر ونفوذ تو اس
میں ضرور پایا جاتا ہے مگر میر وسودا اور اُن کے بعد آنے والے شعرا کے ہاتھوں اردو شاعری نے
ایک مزاج پالیا تھا۔ یہ مزاج حافظ وسعدی کی شاعری کے مزاج سے مختلف ہے۔ یہ مزاج ان فارسی
شعرا کے مزاج سے بھی مختلف ہے جنھوں نے برصغیر کی فضا میں نغمہ سرائی کی۔

جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں۔ غالب، میر وسودا کے مقابلے میں برصغیر کے ان فارسی
شعرا سے کہیں زیادہ ذہنی قرب رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا تو اردو سے کی مگر
نمونہ اپنے سامنے فارسی شاعر بیدل کا رکھا اور اردو میں بیدل کی طرز و روش پر شعر کہنا اپنی شان

وامتیاز سمجھا اس ابتدائی منزل سے گزر جانے اور اپنے انفرادی رنگ وآواز دریافت کر لینے کے بعد بھی فارسی کا اثر غالب کے اردو کلام کی لغت اور محاورہ پر ہمیشہ حاوی رہا۔ اردو کا شاعر ہوتے ہوئے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اردو شاعری کی روایت سے یکسر بے تعلق رہے۔ اس روایت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ شعر کی زبان وہی عام بول چال کی نرم اور شستہ، سلیس اور بے تکلف ڈھلی ڈھلائی، رچی رچائی زبان تھی کہ جس میں ٹھیٹھ اردو یعنی مقامی الفاظ کے علاوہ عربی اور فارسی کے وہ الفاظ وتراکیب شامل ہیں جن میں اردو کی بو باس آ گئی ہے اور جسے فراق صاحب نے اردوویت کا نام دیتے ہوئے ذوق کو اسی کی سادہ اور سپاٹ صورت کا سب سے بڑا ترجمان ٹھہرایا ہے۔

لطف یہ ہے کہ غالب نے پیرویٔ بیدل کے زمانے کے بعد اور فارسی سے اپنی طبعی مناسبت اور لگاؤ کے باوجود جب کبھی چاہا اردوویت کو اپنایا اور اسے اپنے ذہن میں بسی ہوئی شعریت کی آب سے اس طرح چمکا دیا اور اس میں اپنے فکر وفن سے وہ نکیلا پن پیدا کر دیا ہے کہ جس کا جواب مشکل ہی سے ملے گا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

☆☆☆

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مُنھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

☆☆☆

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

☆☆☆

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جاتا

ذیل کے اشعار میں مضمون کی رفعت اور گہرائی کے باوجود زبان کی صفائی اور برجستگی نے کیا کمال دکھایا ہے:

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

اور آخر میں وہ قطعہ جو اپنی موسیقیت اور تصویر کشی کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے:

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند

☆☆☆

جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

اس کے ساتھ ساتھ غالب نے اردو شاعری میں اپنی ذاتی اُپج کی بدولت وہ کرشمے دکھائے ہیں کہ جن سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔ انھوں نے احساس کی نادیدہ سرزمینوں کو دریافت کیا اور ان بوقلموں اور مختلف النوع تجربات سے اردو شاعری کو مالا مال کر دیا کہ جو اُن کی باثروت شخصیت ہی سے ممکن تھا۔ اسی لیے تو اردو شاعری کی فضا میں غالب کی آواز ایک نئے افق سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

سرسید سے ہماری سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان کی تحریک کا اصل مقصد تو مسلمان قوم کو مستقبل سنوارنے کے لیے ایک نئی راہ متعین کرنا تھا مگر اس

کے زیر اثر ہمارے ہاں جو ذہنی اور فکری فضا تیار ہوئی اور جس نئے شعور نے جنم لیا۔ اس میں سلف کی یاد بھی ایک اہم جز کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور یہ سلف کی یاد برصغیر میں عہدِ مغلیہ کے عروج کی یاد تھی۔ حالی نے اپنی مختلف تحریروں میں عام طور پر اردو شاعری کی مذمت کی اور اپنی طبعی سلامت روی کے باوجود جوشِ اصلاح میں یہ فتوے تک دے گئے۔

ع جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

مگر غالب کی سوانح عمری لکھی اور ان کی شاعری اس لیے مذموم ٹھہری کہ سلطنت کے زوال کے زمانے کی نشانی تھی اور غالب اگرچہ سلطنت کے زوال ہی کے دوران پیدا ہوئے تھے مگر چونکہ اپنی شان وشوکت، عز وجاہ، ذہنی وفکری وابستگیوں اور ثقافتی روابط کی بنا پر وہ سلطنت کے عروج کے زمانے کی یاد دلاتے تھے، لہٰذا محترم سمجھے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے تو یہ انتہا کر دی کہ دیوانِ غالب کو ہندوؤں کے مقدس وید کے برابر لا کھڑا کیا۔ اس دعوے کا ایک مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب عہدِ مغلیہ کے ایک برگزیدہ مسلمان پر اتری تھی! خیر بجنوری تو بجنوری تھے ان کو کیا کہیے، اس دور میں غالب کی قدر شناسی اور مغلیہ سلطنت سے ہماری شیفتگی کا بلیغ ترین اظہار تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس جملے میں ہوا ہے۔ مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا ''غالب، اردو اور تاج محل'' گویا اردو سے الگ غالب کی ایک اپنی مستقل حیثیت ہے جس میں اس مخصوص دور کے تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی امتیازات جھلکتے ہیں اور یہی وہ حیثیت ہے جس کو میں نے اس مضمون میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگریزی ادب وشعر کے اثرات کا دور دورہ ہوا تو غالب کی مقبولیت اور بڑھی۔ اردو کی روایتی شاعری سے ان کی روگردانی، ان کی انفرادی اپج، ان کی ندرتِ فکر واحساس اور ندرتِ بیان واظہار کی رومانیت اور خود پسندی ان کی تشکک پرستی، آزاد خیالی، غرض ہر چیز جدیدیت کے معیار پر پوری اتری اور مقبول ٹھہری اور یوں اپنے بارے میں غالب کی یہ پیش گوئی پوری ہوگئی کہ:

شہرت شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اور یہ کہ:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج

میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

مختصر یہ کہ سرسید کے دور سے ہمارے ہاں غالب کی مقبولیت اور شہرت کا دور شروع ہو اور جب اس دور کے قومی شعور نے اپنا شاعر یعنی اقبال پیدا کیا تو اس نے تمام اردو شعرا میں سے صرف غالب ہی کو اس اعزاز کے قابل سمجھا کہ ''بانگِ درا'' سے لے کر ''جاوید نامہ'' تک مختلف مقامات پر انھیں خراجِ تحسین ادا کیا۔ اقبال کا مرثیۂ داغ ایک شاگرد کا ہدیۂ عقیدت ہے۔ اس کی نوعیت دوسری ہے۔

اس صدی میں غالب کی مقبولیت اور شہرت کے اسباب کچھ ہی رہے ہوں غالب کی عظمت بہرحال اپنی جگہ قائم ہے۔ ذرا سوچیے تو کہ وہ اپنی ذات میں کیا کچھ سمیٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف تو وہ برصغیر میں فارسی شعر گوئی کی اس روایت کی جوت جگائے ہوئے تھے کہ جس کا سلسلہ مغلیہ عہد کے شاعروں سے لے کر خسرو کے واسطے سے مسعود سعد سلمان تک پہنچتا ہے۔ اس میدان میں انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود وہ کمال بہم پہنچایا کہ اپنے اکثر پیشروؤں سے سبقت لے گئے۔ دوسری طرف انھوں نے اردو شاعری کی روایت میں ایسے شاندار اضافے کیے کہ جن کے بغیر اردو شاعری وہ نہ ہوتی کہ جو وہ آج ہے۔ ماضی وحال سے اس گہرے شغف کے ساتھ ساتھ غالب نے اس عظیم انقلاب کے مضمرات کا اندازہ بھی کر لیا تھا جو مستقبل میں ہر لحاظ سے ایک بالکل نئے دور کا آغاز کرنے والا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اسے قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ سرسید کی آئینِ اکبری کی تصحیح کی علمی کوشش کو انھوں نے اس خیال سے فضول سمجھا اور رد کر دیا کہ انگریزی عمل داری کے آئین کے مقابلے میں ایک عہدِ پارینہ کے آئین کی کیا حیثیت ہے۔ دراصل غالب نے ایسا زمانہ پایا تھا کہ جب برصغیر میں ماضی وحال اور مستقبل کے دھارے آپس میں مل بھی رہے تھے اور ایک دوسرے سے جدا بھی ہو رہے تھے۔ ان دھاروں کی اُبھرتی ڈوبتی لہروں کا عکس غالب کے آئینۂ ادراک واحساس میں صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا

بالکل بجا ہوگا کہ اس قسم کا ''مہتم بالشان واقعہ'' ہماری ادبی تاریخ میں ایک ہی دفعہ رونما ہوا ہے۔

(شش ماہی غالب، ادارہ یادگار غالب کراچی، شمارہ ۱-۲، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۷ء/ ۱۹۸۸ء، ص ۱۱-۳۶)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

غالب کا نظریۂ وجود

مذہب کے بارے میں مرزا غالب کا رویہ تشکیک اور بے یقینی سے زیادہ قلندری و آزادگی کا ہے۔ وہ خدا کے قائل ہیں، رسالت کے معترف ہیں، امامت کے معتقد ہیں، مگر اعمال وعبادات سے انھیں کوئی رغبت نہیں، گو ان کی افادیت اور ثواب کے منکر نہیں ہیں۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

انھیں جنت اور دوزخ کے وجود کا بھی یقین ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نظریۂ آخرت کو بھی مانتے ہیں۔ اپنی اس بے عملی کے باوجود ان کی شوخیِ طبع آخرت میں کسی سزا سے پہلے ''ناکردہ گناہوں کی حسرت'' کی داد طلب کرتی ہے:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

انھیں یہ بھی گمان ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے اور اُسے کوچۂ محبوب کے مقابلے میں ویران دیکھ کر وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کریں گے تو رضوان سے خوب جھگڑا ہوگا:

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

اس دنیا کے پری زاد جنھوں نے یہاں غالب کو منھ نہیں لگایا، اگر جنت میں حور بن کر

انھیں مل گئے تو اُن سے خوب انتقام لینے کا بھی تہیہ کیے ہوئے ہیں:

ان پری زادوں سے لیں گے خُلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

ان کے ذوق جمال میں جو حرکت، حرارت اور تنوع پسندی ہے اس سے وہ جنت میں اُدب جائیں گے اس تصور سے وہ زندگی ہی میں نڈھال ہوئے جاتے ہیں کہ:

''وہی ایک زمردیں کاخ، وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور، وہی اک حور''

یہ سب تو شاعرانہ شوخیاں ہیں، لیکن ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی بنیادی باتوں پر ان کا ایمان ہے۔ بس ذرا عمل میں آزادگی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد جب دلی میں مارشل لا نافذ ہوا، تو غالب بھی ایک دن پکڑے گئے اور فوجی کرنل برن کے سامنے پیش ہوئے تھے، اس نے پوچھا: ''ویل ٹم مسلمان'' انھوں نے کہا: ''حضور آدھا''۔ کرنل نے پوچھا: ''آدھا مسلمان کیا ہوتا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''حضور میں شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا ہوں، اس لیے آدھا مسلمان ہوں۔'' اور مخدوف شوخی یہ کہ سور کھالوں تو میں بھی آپ جیسا ہوں۔

غالب اپنے صوفی ہونے کا دم بھی بھرتے ہیں۔ وہ حضرت شاہ فخر الدین نظامی محبّ النبی دہلوی کے پوتے میاں کالے صاحب سے اپنی عقیدت وارادت کا اظہار بھی کرتے ہیں، کہیں کہیں اپنی شیعیت کا اعلان بھی کیا ہے، مگر ایک دوسرے سیاق میں بھی کہتے ہیں کہ:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

وہ فلسفی تو نہیں ہے مگر فلسفیانہ مضامین سے انھیں دلچسپی ہے۔ اس لیے ان کا نظریۂ حیات و کائنات اردو کے دوسرے کلاسیکی شاعروں کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے، انھوں نے فلسفہ وتصوف کے موضوعات کو مخلوط بھی کیا ہے جس سے اشعار میں گہرائی اور فکر انگیزی پیدا ہوئی ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مگر ان کے متداول اردو دیوان میں ایسے اشعار ۶۰-۷۰ سے زیادہ نہیں ہیں جن میں مسائل تصوف بیان کیے گئے ہوں۔ البتہ بعض ایسی علامتیں اور محاکاتی حوالے ضرور آگئے ہیں جنھیں مسائل تصوف پر بھی منطق کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی تصوف اور عقائد کے مسلوں میں توحید ایک ایسا موضوع ہے جس سے غالب کو فلسفیانہ دلچسپی رہی ہے۔ وہ خود کو موحد کہتے ہیں۔

ہم موحدّ ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

توحید کو صوفیہ نے رأس الطاعات کہا ہے اور رسوم اس کے ظواہر ہیں جن سے ملتوں اور فرقوں کی پہچان ہوتی ہے۔ رسوم وظواہر کی قید اٹھ جانے کو اصطلاح میں کفر، یا کفر عشق بھی کہا جاتا ہے، جو رسموں سے آزاد ہوا اس کے پاس صرف توحید باقی بچے گی، یعنی ہر اضافت ساقط ہوجائے گی تو ایک بے اضافت حقیقت باقی رہ جائے گی **التوحید اسقاط الاضافات** اسی کا نام ہے۔ غالب نے اس نہایت گہرے اور دقیق مسئلہ کو نہایت سہل اور پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

توحید اسلام کی بنیاد ہے، لیکن یہ محض وحدت عددی نہیں ہے، فلاسفہ، متکلمین، صوفیہ اور اصول عقائد سے بحث کرنے والے علماء نے اس پر اتنی دیدہ ریزی سے بحث کی ہے کہ یہ فلسفہ کا نہایت دقیق موضوع بن گیا ہے۔ اس میں ذات وصفات، تشبیہ وتنزیہہ، حدوث وقدم جیسے بہت سے متقاطع مسائل بھی شامل ہوگئے ہیں۔ فلسفہ جب ان الجھے ہوئے سوالوں کو حل کرنے سے عاجز ہوا تو ہمارے صوفیہ نے کشفی اور وجدانی طور پر اسے حل کرنے کا راستہ پایا ہے۔ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی، امام غزالی اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے بہت سے مباحث کی بنیاد کشف ووجدان ہی پر ہے۔ ہمارے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو ہم کشف

وجدان کو جھٹلائیں یا اُن کی تصدیق کریں۔ پہلی صورت میں ہم صرف فلسفہ سے استشہاد کر سکتے ہیں جس سے عقیدہ کو کچھ زیادہ سروکار نہیں، دوسری صورت یعنی تصدیق کرنے میں بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ وجدان سے دلیل حاصل کرنا قرآن کریم سے بھی ثابت ہے۔ حضرت یوسف کے قصے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول موجود ہے، اِنّی لَاَجِدُ رِیحَ یُوسُفَ لَوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف:۹۴) اور خضر و موسیٰ کی حکایت میں حضرت خضر کی ساری دلیلیں کشفی اور وجدانی ہیں۔

آدابِ سلوک میں مقام توحید کا مکشوف ہو جانا غایت کبریٰ سمجھا جاتا ہے۔ ان اسرار کو سمجھنے کے تین ممکنہ وسائل ہیں: بحث وعلم کے ذریعے سے، مشاہدہ وعرفان کے وسیلے سے اور کشف ووجدان کے واسطے سے۔ جن حضرات پر توحید مکشوف ہوئی ہے انھیں مرتبہ حق الیقین کشف ہی سے حاصل ہوا ہے اور پھر وہ عالم بے رنگی میں پہنچ گئے ہیں جہاں کلام بھی حرف وصوت کا محتاج نہیں رہتا۔

اے خدا بما تو جاں را آں مقام
کاندراں بے حرف می روید کلام

غالب کا توحیدی ذوق فلسفہ وتصوف کی کوئی گہری بنیاد نہیں رکھتا، اس کا تعلق کشف وجدان یا مشاہدہ وعرفان سے بھی نہیں ہے۔ تصوف کے کچھ روایتی مسائل ہیں جنھیں غالب نے اپنے نظریۂ حیات وکائنات کے دائرہ میں دیکھا اور پرکھا ہے، انھیں مسائل کو شاعرانہ لطافت اور حکیمانہ ذہانت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اُن کے فکر میں ویدانت کا پرتو بھی ہے اور یہ بلا واسطہ آیا ہے۔ اپانشید کہتے ہیں کہ واجب الوجود ایک حقیقت مطلقہ وحقیقت اعلیٰ ہے جس کا کوئی شریک نہیں ،اس کے سوا دوسرا کچھ موجود نہیں، باقی سارے وجود ''مایا'' ہیں یعنی اعتباری ہیں، بقول میرؔ:

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

''اکیم برہم دوتیونا ستے'' غالب اپنے خطوں میں بار بار **لاموجود الا اللہ ولاموثر فی**

الوجود الا اللہ کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

مسئلہ دراصل یہ ہے کہ فنا وبقا کیا ہے اور خالق ومخلوق کا رشتہ کیا ہے؟ صوفیہ ایک حدیث قدسی کثرت سے بیان کرتے ہیں جسے گروہ محدثین ضعیف کہتا ہے، **کنت کنزاً مخفیاً فأحبت ان اُعرف فخلقت الخلق** کہ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے خلق کو پیدا کیا۔ یہاں جو فلسفیانہ اشکال پیدا ہوتا ہے اُسے غالب نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب وجود یا شہود ایک ہی ہے تو جو شاہد ہے وہی مشہود ہے تو آخر مشاہدہ کون کس کا کر رہا ہے؟ خزانہ غیبی کی پہچانے جانے کی خواہش تو وجود غیر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسی نے یہ سوال پیدا کیا کہ واجب الوجود ایک ہی ہے تو وہ ازلی وابدی بھی ہے، اس کی صفات کیا اس کی ذات سے الگ ہیں؟ اگر یہ مان لیں تو ذات بحت سے حادث کا پیدا ہونا لازم آتا ہے۔ اُپنشد کہتے ہیں کہ صفات خداوندی بالفعل ظاہر ہیں شیخ اکبر انھیں تصورات علمیہ اور اعیان ثابتہ کا نام دیتے ہیں ،ویدانت اسی کو ''مایا'' کہتا ہے۔ حضرت مجدد کا فرمانا ہے وجود ایک نہیں ہے، دیکھنے میں ایک معلوم ہوتا ہے اسی کو وحدت شہود کہتے ہیں، خدا نے کائنات کو مرتبۂ وہم میں خلق کیا ہے، ہم اسے موجود سمجھتے ہیں مگر وہ درحقیقت موہوم ہے۔

ہست ازپس پردہ گفتگو ہے من و تو
چوں پردہ بیفتد نہ تو مانی ونہ من

یہ وہم ہستی ایسا ہے کہ اس کی نمود تو ہے وجود نہیں ہے۔ غالب کہتا ہے۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
شاہد ہستیٔ مطلق کی کمر ہے
لوگ کہتے ہیں کہ ''ہے'' پر ہمیں منظور نہیں

یہ وہی مرتبۂ وہم میں خلق ہونے کا مسئلہ ہے کہ محبوب کی کمر ہے بھی اور نہیں بھی۔

شیخ اکبر نے ایک اور لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ عربی میں آدمی کو انسان کہتے ہیں، اور انسان آنکھ کی پتلی کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ فارسی میں مردم کا بھی یہی حال ہے کہ دونوں معنی رکھتا ہے، عجیب تر یہ کہ اردو ہندی میں پُتلی اور پُتلا بھی یہی دونوں مفہوم رکھتے ہیں۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ خدا حسنِ مطلق اور تجلی ازلی تھا لیکن اپنے آپ کو دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا، اس نے ''انسان'' کو پیدا کیا جو گویا ذاتِ مطلق کی آنکھ کی پُتلی ہے۔ اسے غالب نے یوں کہا ہے ؎

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

آئینہ وجود ازلی ہے اور یہ کائنات اس آئینہ کا زنگار ہے اور جوہر آئینہ پلکوں کی شکل بن گیا ہے، جو تقاضائے دیدار کا اثر ہے۔

خلق اور خالق کے رشتہ کو صوفیہ اور فلاسفہ نے متعدد تشبیہوں سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے نوفلاطونی فلسفہ میں اسے اشراق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی خدا کو **نـــور السموات والارض** کہا گیا ہے، صوفیہ جب ذات بحت کی تجلی کا مشاہدہ کرنے کی منزل میں پہنچتے ہیں تو وہاں تاریکی ہی تاریکی بتاتے ہیں اور جدید سائنس بھی یہ کہتی ہے کہ جب نور کا وفور ایک خاص غایت کو پہنچتا ہے تو وہ سیاہی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کسی نے وجود کائنات کو برف سے تشبیہ دی ہے جس کا وجود پانی کے سوا کچھ اور نہیں، پھر بھی پانی سے الگ نمود رکھتا ہے اور تحلیل یا فنا ہو کر پھر پانی بن جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات میں وجود غیر محض اعتباری ہے۔ اسے اصل اور ظل کا رشتہ بھی بتایا گیا ہے۔ سائے کا اپنا مستقل وجود نہیں، وہ اصل سے الگ بھی نہیں اور خود اصل بھی نہیں، وہ فنا بھی ہو جاتا ہے، اصل اور ظل پر دوئی کا شبہ بھی ہوتا ہے، مگر یہ دوئی محض وہمی و اعتباری ہے۔ بعض شعرا نے ہستیٔ ممکن کو ہستیٔ واجب الوجود کا خواب کہہ دیا۔

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

احوالِ غالب

یعنی ایک نظریہ تو یہ کہ ہم عالم خواب میں ہیں اور سارے کارخانے کو ہما ہمی کے ساتھ چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں، موت ہماری بیداری ہوگی اور یہ خواب ٹوٹ کر معدوم ہو جائے گا۔ حضرت علیؓ سے یہ قول منسوب ہے کہ **الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا** (لوگ سو رہے ہیں تو گویا مریں گے تو بیدار ہو جائیں گے) دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ہستی واجب الوجود خواب دیکھ رہی ہے یا حقیقت مطلقہ عالم خواب میں ہے ہم سب اس خواب کے کردار ہیں، جب وہ ہستی بیدار ہوگی تو ہم ناپید ہوں گے۔

زندگی اور اس میں کثرتِ مظاہر کو سمندر سے بھی تشبیہ بھی دی گئی ہے۔

ہے مشتمل نُمودِ صُور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ موج و حباب میں

سمندر ایک وسیع حقیقت ہے اس میں لہریں بھی اُٹھ رہی ہیں، حباب بھی پیدا ہو رہے ہیں، قطرہ بھی اسی سمندر سے نکلتا ہے اور پھر اپنی نمو کھو کر سمندر کا حصہ بن جاتا ہے لیکن ان سب اشکال وصور کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ علامت غالب کا پسندیدہ موضوع ہے:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

دوسری جگہ کہتے ہیں:

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ ''انا البحر''
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

اور:

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

☆☆☆

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالب نے شبنم وخورشید کی علامتوں میں بھی فنا وبقا کے اس رشتے کو بیان کیا ہے:

پرِ توِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

شبنم کا وجود بھی حادث اور وہمی ہے اور اس کا اشتیاق بھی ایک بڑی ہستی میں ختم ہونے کے لیے ہے جب تک وہ مہرِ حقیقت طلوع نہیں ہوتا، شبنم ''موجود'' ہے لیکن خورشید کی نظرِ عنایت اُسے مقصدِ اعلیٰ سے ہمکنار کردیتی ہے۔

کائنات کی کثرت اور ذاتِ مطلق کی احدیت کو ذرہ وخورشید کی تمثیل میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ سورج کی روشنی کہیں سے چھن کر آتی ہے تو چھوٹے چھوٹے ذرے وجد کیف کے عالم میں رقص کرتے ہوئے اور کرنوں کے سہارے خورشید کی طرف صعود کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بعض صوفیہ نے کائنات کی قوتِ محرکہ عشق کو بتایا ہے۔ زمین کی گردش، لیل ونہار کا انقلاب، ستاروں کا طلوع واُفول، یہ سب عشق ہی کے مظاہر ہیں۔ اس کیفیت کو ذرہ وخورشید کی علامتوں سے بہت سے شاعروں نے بیان کیا ہے مگر غالب نے اس میں فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ شاعرانہ نفاست بھی پیدا کردی ہے۔

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرِ توِ خورشید نہیں

جہاں روشنی ہوگی وہیں ذرے نظر آئیں گے، یہ نہ ہو تو وہ بھی نہ ہوں گے۔

ہوئے اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پُر افشاں جو ہر آئینے میں مثلِ ذرّہ روزن میں

☆☆☆

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئنہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

ایک اور استعارہ رشتہ وگرہ کا ہے۔ کسی ڈورے میں گرہ ڈال دیجیے تو اس کی اپنی نمود ہوگی، مگر وجود کچھ نہیں ہے گرہ کھول دیں تو دھاگا ہی باقی بچے گا۔ صورِ علمیہ کا شیخ اکبر کا نظریہ یہ ہے کہ لکڑی سے ہزاروں چیزیں بنتی ہیں، میز، کرسی، کواڑ، الماری وغیرہ۔ ان کے وجود کی اصل لکڑی ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ کرسی کی شکل کو لکڑی سے جدا کر کے دیکھ سکے تو وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے گا۔

وجود کی ایک اور تشبیہ لوہے اور آگ سے بھی دی گئی ہے۔ لوہا آگ میں رہ کر خود بھی سرخ ہوجاتا ہے اور اس میں آگ کی صفات بھی پیدا ہوجاتی ہیں، پھر وہ اپنی اصلی حالت پر واپس آتا ہے تو وہ کیفیات زائل بھی ہوجاتی ہیں۔ یہ تشبیہ وحدت الشہود کے نظریہ کی ترجمان ہے۔ غالب کا پسندیدہ استعارہ عکس اور آئینہ کا ہے اور یہ بھی شہود کی وحدت یا ظلیت کو بتاتا ہے۔ غالب کا رجحان وحدت الوجود کی طرف ہے مگر اس میں اُن کا ذہن بہت زیادہ واضح نہیں ہے نہ وہ اس فلسفہ کی باریکیوں میں جاتے ہیں۔ کبھی وہ ویدانتی نظریہ کے ترجمان ہیں، کہیں فلسفہ سے اخذ کرتے ہیں، کبھی وحدت الشہود کے قائل نظر آتے ہیں۔ مگر انھوں نے ان مضامین کو شاعرانہ آب ورنگ دے کر بہت دل نشیں ضرور بنادیا ہے۔ حقیقت مطلقہ عیاں بھی ہے اور مستور بھی:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

سارے مظاہر کائنات اسی کی تجلیِ صفات ہیں:

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئنہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

ہر شے میں اُسی کا جلوہ ہے پھر بھی وہ سب سے جدا سب سے الگ ہے:

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

پھر وہ عالم بے رنگ کی سرحد تک پہنچ کر پکار اُٹھتے ہیں:

ہستی ہے نہ کچھ عدم غالبؔ
آخر تُو کیا ہے؟ اے ''نہیں ہے''

ویدانتی اثر سے وہ دنیا کو مایا جال اور لیلا بھی سمجھنے لگتے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

کہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کثرتِ جلوہ حجاب بن گئی ہے اس لیے کوئی اُسے دیکھ نہیں سکتا:

جب وہ جمال دل فروز صورتِ مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں مُنھ چھپاے کیوں

☆☆☆

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

☆☆☆

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

رویت باری کا مسئلہ بھی فلسفہ وکلام کے الجھے ہوئے مباحث میں سے ایک ہے۔ انسان کی آنکھ خدا کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں دیکھ سکتی۔ دونوں کے بارے میں مختلف شواہد دیے گئے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب خواہش دیدار کی اور ربِ اَرنی کہا تو انھیں جواب ملا کہ لن ترانی تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، پھر قرآن میں ہے: **لا یدرکہ الا نصار وھو یدرک الابصار** اس نور مطلق

کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ رویت کے لیے مکان، جہت اور لَون کی شرط ہے، اس سے خدا کا محدود ہونا لازم آتا ہے۔ مگر قرآن ہی میں ''**وجوہ یومئذ ناضرۃ'' الی ربھا ناظرۃ''** بھی آیا ہے کہ قیامت کے دن خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے خدا کو دیکھتے ہوں گے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ آخرت کی رویت کو ہم دنیا کی رویت پر قیاس نہ کریں، خدا ہی جانتا ہے کہ وہاں دیدار کس شکل میں ہوگا۔ نور حقیقت کا ایک ہلکا سا پرتو اِن مجازی مظاہر میں نظر آتا ہے، مجرّد کیفیت میں اُسے کہاں دیکھا جا سکتا ہے:

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قدو رُخ سے ظہور کی

مظاہر کی یہ رنگا رنگی حیرت کے سبب سے ہے کہ اس تجلّی کا تحمل دشوار ہے:

کیا آئنہ خانے کو وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پَر تو خورشید عالم شبنمستاں کا

لاکھ پَردوں میں چھپنے کی کوشش کے باوجود ہر طرف عیاں ہے، اس کی مستوری میں بھی ایک لُبھانے والی ادا ہے:

مُنھ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنھ پر کھلا

ان پردوں سے بھی ایسی مسحور کن پراسرار آوزیں سنی جا سکتی ہیں جو حقیقت مطلقہ کا پتا دیتی ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ساز کا
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ ورباب میں

اُسے دیکھنا اس لیے ممکن نہیں کہ اُس کے سوا غیر کا وجود ہے ہی نہیں:

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ کائنات اوراس میں جو کچھ ہے دائمی تگ ودو میں لگے ہیں اورحقیقت مستورہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں:

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک — بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
غالبؔ مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو — جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

غالب جانتے ہیں کہ وہ حسن ازلی وہ حقیقت مطلقہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے احاطۂ ادراک میں نہیں آسکتا۔لیکن یہ سب مظاہر اُسی کی طرف اشارہ کررہے ہیں اورحسن کائنات میں ہی حسنِ ازلی کوتلاش کیا جاسکتا ہے؟ رسوم وظواہر مقصود بالذات نہیں ہیں:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہمارے اورحسنِ مطلق کے درمیان ایک حجاب تواپنی ہستی ہی ہے۔بقول میرؔ:

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

دوسرا حجاب 'وہم غیر' ہے یہ عرفانِ نفس میں مانع ہوتا ہے اور **من عرف نفسه فقد عرف ربه**:

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اس کے اسرار بھی عجیب ہیں،الآن کما کان اورکل یوم ہوفی شان،دونوں باتیں بیک وقت صادق آتی ہیں حالانکہ ان میں منطقی تضاد موجود ہے۔کائنات میں جوتغیر ہے،زوال اورفنا کے جومناظر ہم دیکھ رہے ہیں ان کی غالب ایک توجیہ کرتا ہے؟ جیسے حسن زلی اپنی آرائش میں مصروف ہے اورکائنات کا ذرّہ ذرّہ تمنائے دیدار میں سرشار ہے جب وہ اپنی نقاب الٹے گا تو اس کی ذات کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

وہ ذات واجب الوجود جوستر ہزار پردوں میں چھپ کربھی ہر شے میں آشکارا ہے،ہر شے کا مطلوب ومقصود بھی ہے۔اُسے پالینا اسی لیے دشوار ہے کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔**نحن اقرب الیه من حبل الورید**۔غالب نے اس نکتے کوسہل ممتنع میں بیان کیا ہے:

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

پھر وہ ایک دلچسپ مضمون عاشقانہ رنگ میں سنوارتا ہے۔آخر یہ معما کیا ہے کہ بقول شاعر:

بے حجاب اتنا کہ جلوہ اس کا ہرذرے میں ہے
اور حجاب اتنا کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

جب وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اوردل بھی اُسی کا جلوہ گاہ ہے(فی انفسکم افلا تبصرون)روح بھی اسی کی صدا پر وجد کررہی ہے تو درمیان میں یہ پردہ آخر کیوں ہے؟

یہ کہہ سکتے ہو ''ہم دل میں نہیں ہیں'' پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہوتو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

جواب ملا کہ تمھارے جذبے میں اخلاص کی کمی معلوم ہوتی ہے،سچے دل سے لگن کے ساتھ ہمیں ڈھونڈو گے تو پاجاؤ گے۔غالبؔ جیسا شوخ طبع شاعر ان طفل تسلیوں سے بہلنے والا کہاں،کہتا ہے:

غلط ہے جذب دل کا شکوہ ،دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو،کشاکش درمیاں کیوں ہو

وحدت الوجود کا فلسفہ تمام تر ذوقی اورکشفی چیز ہے۔عام آدمی تو اسے کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا،خواص میں علمائے ظاہر تضاد اورتناقض کے خارزار میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔علمائے باطن یعنی صوفیہ پر یہ بقدر ظرف مکشوف ہوتا ہے۔اگر گوشۂ نقاب ذرا سا سرک جائے تو وہ عالم ہوتا ہے

جسے عبدالرحیم خان خاناں نے یوں کہا ہے:

رحمین بات آگم کی کہن سنن کی ناہیں
جانت ہیں سو کہت نہیں کہت سو جانت ناہیں

ساری پہنائیوں کے ہوتے ہمارا خیال بہرحال محدود ہے، اس میں وہ لامحدود کیسے سما سکتا ہے، جب ہم قید وجود سے آزاد ہوں گے تو خیال کا تنگ دائرہ بھی ٹوٹ جائے گا، اب اس کا ادراک آسان ہو سکے گا۔ اس نہایت لطیف اور دقیق مضمون کو مولانا روم نے ایسی خوبی سے بیان کر دیا ہے کہ الفاظ معدوم اور معنی مجسم ہو گئے ہیں:

من زتن عریاں شدم او از خیال
می خرامم در نہایت الوصال

غالب بھی عجز ادراک کے معترف ہیں:

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے

لیکن طالب کی نظر اپنے مطلوب پر رہنی چاہیے۔ پریشاں نظری سے پراگندہ دلی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں کثرت میں وحدت ہے۔ کیفیات میں تضاد اور تخالف ہے، تجلی اسماء کی ہر آن نرالی شان ہے، اس میں سر رشتۂ مقصود کا تلاش کر لینا ہی کمال ہے۔ وہی دلیل وحدت بن جاتا ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سرپائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مےِ ذات چاہیے

غالب کے کلام میں حیرت، استعجاب، تشکیک اور استفہام کا مصدر و منبع دراصل یہی مسئلہ وجود ہے اور اسی عینک سے وہ اپنے گردوپیش کی کائنات کو دیکھتے ہیں۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ سوالات سیدھے سادھے ہیں مگر ان کے جوابات بہت الجھے ہوئے ملتے ہیں، غالب مایوس نہیں ہوتے نہ طلب سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ اُسے کوئی پا نہ سکا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

لیکن مقصود طلب کی لذت ہے اس میں اپنے آپ سے گزر جانا اس سے اچھا ہے کہ تھک کر بیٹھ جائیں:

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اسی کشاکش طلب سے یہ کارخانۂ ہستی رونق پذیر ہے، فنا کی جبلت ہی نے بقا کی صلاحیت پیدا کی ہے:

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

یہی طلب ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہیں اور یہی ہمارا سامانِ مرگ بھی ہے:

پوچھے ہے کیا وجود عدم اہلِ شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں انھوں نے مسئلہ وجود کو غیر معمولی حسن بیان سے منظوم

کیا ہے:

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا ، بادبہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم ،خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق بے ربطیٔ شیرازہ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

آخر یہ توحید انھیں مرتبۂ تسلیم تک پہنچاتی ہے:

اسدؔ سودا سے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اس کا ،ابرِ بے پروا خرام اس کا

☆☆☆

اے اسدؔ بے جا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم ہیں یہ دعویٰ آرائی عبث

☆☆☆

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اور:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اسی پر ان کے نظریۂ حیات وکائنات کی اساس ہے۔وحدت میں کثرت آرائی ان کی آنکھیں کھولتی ہے اور انھیں جزو میں کُل کا جلوہ دینے کے قابل نگاہ عطا کرتی ہے:

اسدؔ بند قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

اور یہی وہ موضوع ہے جو لطیف ترین احساسات کو بیدار کرتا ہے، ذوقِ تماشا ابھارتا ہے،تمنائے چیدن پیدا کرتا ہے،یہی اُن کے حکیمانہ افکار کا منبع ہے۔اسی میں وہ کرب پوشیدہ ہے جس کی زیریں لہر ہمیں اُن کی شاعری میں جابجا نظر آتی ہے۔اُسی نے انھیں فکر کا وہ گداز بخشا ہے کہ:

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اور:

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزاں ہے
کہ شیشہ نازک و صہبا ہے آبگینہ گداز

انھیں مضامین کے سہارے وہ آکاش سے پاتال تک سیر کرتے ہیں اور یہی اردو کے تمام شاعروں کے مقابلے میں ان کے غالب ہونے کا راز ہے۔

(شش ماہی غالب،ادارہ یادگار غالب کراچی،شمارہ ۱-۲،جولائی تا دسمبر ۱۹۸۷ء/ ۱۹۸۸ء،ص ۲۷-۴۲)

ڈاکٹر خالد حسن قادری

احوالِ غالب

(غالب کی اپنی تحریروں سے مرتب کردہ)

ولادت

غالب چوزناسازیِ فرجام نصیب
ہم بیمِ عدو دارم دہم ذوقِ حبیب
تاریخِ ولادتِ من از عالم قدس
ہم شورشِ شوق آمد و ہم لفظ غریب

(۱۲۱۲ھ) (۱۲۱۲)

عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالمِ آب وگل۔ قاعدۂ عالم یہ ہے کہ عالمِ آب وگل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

نسب وخاندان

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک — در تمامی زِ ماہ دہ چندیم

ترک نژادم ونسب من بہ افراسیاب وپشنگ می پیوند دو بزرگان من از آنجا کہ باسلجوقیان پیوند ہم گہری می داشتند۔ بعہدِ دولت ایناں رایتِ سروری وسپہ گری افراشتند۔ بعد سپری شدن روزگار جاہ مندی آں گردہ چوں ناروائی وبے نوائی روئے آوردد جمع را ذوق رہ زنی و غارتگری از جائے برد۔

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نشان سے شاہ عالم کا نوکر رہا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ میں پایا۔ باپ میرا مرزا عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کا نوکر ہوا۔ پھر حیدرآباد میں نواب نظام علی خاں کا ملازم ہوا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی والد نے گھبرا کر الور کا رخ کیا۔ راجہ راؤ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔

پرورش

نصراللہ بیگ خان بہادر میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبیدار تھا اس نے مجھے پالا۔

تعلیم وتربیت

میں نے ایام دبستاں نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ اور بعد اس کے لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق وفجور وعیش وعشرت میں مبتلا ہوگیا۔

جائداد واملاک[1]

ہمارے اور اُن (منشی بنسی دھر، منشی شیونرائن کے نانا) کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان میں تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھی چند نے مول لی ہے۔ اس دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور

سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک اور کٹرا کہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹرہ کہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔

بیعت

شاہ محمد اعظم صاحب خلیفہ تھے، مولانا فخر الدین صاحب کے، میں مرید ہوں اس خاندان کا۔

شادی [2]

تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷/رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم حبسِ دوام صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی گئی۔ اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا۔ مجھے اس زنداں میں ڈال دیا گیا۔ فکر نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد اس جیل خانہ سے بھاگا تین برس بلادِ مشرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔ اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب یہ دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے تو دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔

حُلیہ

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جب کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہے۔ جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ہے۔ ملّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، مُنھ پر داڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔

خطاب والقاب

نوابی کا مجھ کو خطاب ہے۔ اور اطراف وجوانب کے امرا سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں بلکہ بعض انگریز بھی، چنانچہ صاحب بہادر نے جو، ان دنوں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر نواب اسد اللہ خاں، لکھا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نوابی کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلافِ دستور ہے۔ یا نواب اسد اللہ خاں، یا میرزا اسد اللہ خاں اور بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔

خلعت واعزاز

میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچہ اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنشن جاری ہوگئی لیکن دربار اور خلعت بند۔ میں ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ سر پیچ اور مالائے مروارید۔ یہ تین رقم خلعت مِلا۔ ازاں بعد دہلی میں دربار ہوا۔ مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔

معاشقہ

مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ چالیس ۴۰ بیالیس ۴۲ برس کا یہ واقعہ ہے باآں کہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔ اس فن میں بیگانہ محض ہوگیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا عمر بھر نہ بھولوں گا۔

ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد وورع منظور نہیں۔ اور ہم مانعِ فسق وفجور نہیں، پیو، کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رکھو کہ مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی

کہاں کی مرثیہ خوانی؟

شاعری و تصنیف

خاکسار نے ابتدائے سنِ تمیز میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہِ دہلی کا نوکر ہوکر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغِ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی میں بہت بکا۔ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا۔ ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا۔ تین رسالے نثر کے۔ یہ پانچ نسخے مرتب ہوگئے۔ اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ ملا۔ غزل کی داد نہ پائی۔ ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔ گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارت فارسی نا آمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔ زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کادی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ غریزی کا زوال ہے اور یہ حالت ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

تنقیدی اشارے

حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبلّغ ہوا۔ خیال ہائے نازک و معنی بلند لایا۔ اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری، عرفی، نوعی نے۔ سبحان اللہ قالبِ سخن میں جان پڑگئی اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربا دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرہ میں ہیں۔ رودکی، و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا۔ اور سعدی کی طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا فغانی کا انداز پھیلا۔ اور اس میں نئے

نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو اب طرزیں تین ٹھہری ہیں۔ خاقانی اس کے اقران۔ ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر۔ ممتاز و غیر ہم کا کلام، ان تین طرزوں میں سے کس پر ہے۔ بے شبہ فرماؤ گے یہ طرز ہی اور ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ یہ ان کی چوتھی طرز ہے۔ مگر فارسی نہیں ہیں۔ دار الضرب شاہی کا سکّہ نہیں ہے ٹکسال باہر ہے۔ داد۔ داد۔ انصاف۔ انصاف۔

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار   زیک جام اندر بزمِ سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں   خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ دراشعار ایں قوم   ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ چیز دگر پارسیوں کے حصے میں آئی ہے۔ یاں اردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی علیہ الرحمۃ:

بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو   رکھے گا تم سے کون عزیز اپنی جان کو
دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار   خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا
قائم: قائم اور تجھ سے طلب بوسہ کی کیونکر مانوں   ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بدآموز نہیں
مومن: تم مِرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ نشتر ہیں۔

حزیں زترک تازہئ آں نازنین سوار ہنوز   زسبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

حزیں کے اس مطلع میں ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے۔ متتبع کے واسطے سند نہیں ہوسکتا یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا حزیں تو آدمی تھا اگر یہ مطلع جبریل کا ہوتو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

''تا ہر چہ گفتی از تو مکرر شنودے۔''

اکثر صاحب گفتی کو بہ یائے مجہول پڑھتے ہیں تا کہ می گفت کے معنی پیدا ہوں۔ گفتی بہ یائے معروف بے تکلّف درست اور بہ یائے مجہول غلط ہے۔ اور اگر وہاں شدے کہیے تو یہاں گفتے بہ یائے مجہول کہیے۔ غیبت اور خطاب کا تفرقہ مٹا دیجیے۔ گفتی بہ یائے مجہول میں خطاب

حاضر مقرر رہتا ہے۔اور ''تو'' کا لفظ جو قریب ہے وہ اس معنی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔نظائر اس کے فارسی میں بہت ہیں۔

دعویٰ اور چیز ہے اور کمال اور ہے۔علمِ عربی اور شے اور فارسی کی حقیقت اور ہے۔

جلالائے طباطبائیؒ نے شیدائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا۔جس کا مضمون یہ تھا کہ ایک دن مولانائے عرفی اور ابوالفضل میں مباحثہ ہوا۔شیخ نے عرفی سے کہا کہ ہم نے تحقیق کو بہ سرحدِ افراط پہنچا دیا۔اور پارسی میں خوب کمال پیدا کیا۔عرفی نے کہا اس کو کیا کرو گے۔جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے،گھر کے بڈھوں سے جو بات سنی فارسی میں سنی۔

شیخ گفت ما فارسی از انوری وخاقانی فرا گرفتہ ایم وشما از پیرزالاں آموختہ اید۔عرفی فرمود انوری وخاقانی نیز از پیرزناں آموختہ باشند۔

ہندوستان کے سخن وروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔خسرو کیخسر وقلم وسخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی وہم طرح سعدی شیرازی ہے۔خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے۔یہ کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔ناصر علی بیدل غنیمت،ان کی فارسی کیا ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھیے۔منت۔مکیں۔واقف۔قتیل۔یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ان حضرات میں عالم علومِ عربیہ کے شخص ہیں۔خیر ہوں۔فاضل کہلائیں۔کلام میں ان کے مزا کہاں۔ایرانیوں کی سی ادا کہاں۔فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے۔اس میں پیرویٔ قیاس ایک بلائے عام ہے۔وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سوجگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے باایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے۔منہ کی کھاتا ہے۔مولوی احسان اللہ کو صنائعِ لفظی میں دست گاہ اچھی تھی۔اس شیوہ وروش کو خوب برت گئے۔فارسی وہ کیا جانیں۔قاضی محمد صادق خاں اختر عالم ہوں گے شاعری سے ان کو کیا علاقہ۔

سانس میرے نزدیک مذکر ہے لیکن اگر کوئی مونث بولے تو میں منع نہیں کر سکتا۔خود سانس کو مؤنث نہ کہوں گا۔سیف کو عدو کُش کہو اور کمند کو عدو بند۔سیف عدو بند نہیں ہو سکتی۔تم کو کہتا ہوں کہ تلوار کو عدو بند نہ کہو۔کوئی اور اگر کہے تو اس سے نہ لڑو۔زلف کو شب رنگ اور شب گوں کہتے

ہیں۔شب گیر زلف کی صفت ہر گز نہیں ہو سکتی۔شب گیر اس سفر کو کہتے ہیں کہ پہر جو گھڑی رات رہے چل دیں۔نالۂ شب گیر آہ ورازی آخر شب کو کہتے ہیں،زلف شب گیر نہ مسموع نہ معقول۔

سخن کا قافیہ بن درست ہے اور تن بھی جائز ہے۔یعنی سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی نظر شگفتن۔گوش شگفتن ہم نہیں جانتے اگر چہ مولانا نورالدین ظہوری نے لکھا ہے:

نظارہ را زخونِ دلم گل در آستیں

خونش مگو بگو کہ ز چشم چمن چکید

یہ نہ سمجھنا کہ چمن از چشم چکیدن شگفتن گوش ونظر کی مانند غرابت رکھتا ہے۔یہ خوں فشانی چشم کا استعارہ ہے اور خوں فشانی صفت چشم ہو سکتی ہے۔اگر نظر کا خوش ہونا اور کان کا شاد ہونا جائز ہوتا تو ہم اس کا استعارہ بہ شگفتگی کر لیتے۔خوش رہنا جب صفتِ چشم وگوش نہ ہو تو ہم کیا کریں۔

لفظ بے پیر۔تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا۔میرزا جلال اسیر اور ان کا کلام مستند ہے۔میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے۔بے پیر ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحبِ زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں۔

عیدست بادہ شد فلک و ساغر آفتاب

خالصتاً للہ فلک ظرف اور آفتاب مظر دف ہے۔یہ شخص ظرف کو مظروف اور مظروف کو ظرف ٹھہراتا ہے۔اس کو کون مسلّم رکھے گا اس سے بڑھ کر ایک اور خدشہ ہے۔یعنی مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہِ شبہ شرف ہے۔آفتاب وساغر میں تدویر وجہِ شبہ ہے۔شراب اور فلک میں وجہ تشبیہ کہاں؟

وطن سے محبت (بنام ضیاء الدین خاں نیرّ)

اشک وآہِ غالب نامراد یعنی آب وہوائے اکبرآباد بہ شما ساز گار باد۔گر فتم کہ خود را بہ سفر گرفتہ ونزدیک خود از من دور تو رفتہ اید۔اما چوں ہنوزم در وطن اید ہمانہ کہ نزدیک بامن مائید۔

زینہارا اکبرآبادرابچشم کم ننگرندواز رہ گزرہائے آن دیارالحفیظ گوئے والاماں سرائے گزرند۔ کہ آں آبادوچہ ویراں وآں ویرانۂ آباد بازی گاہ ہم چومن مجنونے وہنوزآں بقعہ رادر ہر کف خاک چشمۂ خونے است۔ روزگار ے بود کہ درآں سرزمین جز مہر گیا نہ رستے وہیچ نہال جز دل بارنیاوردے۔نسیم صبح درآں گل کدہ بہ مستانہ وزیدن ولہا آں از جابرانگیختے کہ رنداں راہوائے صبوجی ازسروپارسایاں رانیت نمازازضمیرفروروزیدن۔

مذہب

مسائل دیکھنا اور مسائل نفاس وحیض میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقتِ حقہ وحدت وجودکواپنے دل نشیں کرنا اور ہے۔مشرک وہ ہیں جو وجودکوواجب اور ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔مشرک وہ ہیں جومسیلمہ کونبوت میں ختم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔مشرک وہ ہیں جونومسلموں کوابوالائمۃ کا ہمسر جانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجودالا اللہ ولاموثرفی الوجودالا اللہ سمجھے ہوئے ہیں۔

انبیاءسب واجب التعظیم اوراپنی اپنی صفت میں سب مفترض الاطاعت تھے۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم پرنبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔مقطع نبوت کامطلع امامت کا نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے۔اورامام من اللہ علی علیہ السّلام ہے۔ثم حسنؑ۔ثم حسینؑ۔اسی طرح تامہدی موعودعلیہ السّلام۔

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کومردوداورشراب کوحرام اوراپنے آپ کو عاصی سمجھتا ہوں۔اگر مجھ کودوزخ میں ڈالیں گےتو میرا جلنامقصودنہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوگا۔اوردوزخ کی آگ کوتیز کروں گا تا کہ مشرکین اور منکرینِ نبوتِ مصطفوی اورامامتِ مرتضویؑ اس میں جلیں۔

شرط است کہ بہر ضبطِ آداب و رسوم — خیزد بعد از نبیؐ امامِ معصوم
زِ اجماع چہ گوئی بہ علیؑ باز گرائے — مہ جائے نشین مہر باشد نہ نجوم
علیؑ راست بعد از نبیؐ جاے اُو — ہماں حکم کُل دارد اجزائے اُو
ہمانا پس از خاتمِ المرسلیںؐ — بو دتا بہ مہدیؑ علی جانشیں
منصور فرقۂ علیؑ اللّہیان منم — آوازہ انا اسد اللہ برآورم
غالبؔ نام آورم نام و نشانم مپرس — ہم اسد اللہ ام وہم اسد اللّٰہیم
جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جوکہ ہووے صوفی — شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

عقائد

وقت حاجت ہرکہ گوید یاعلی — باحقش کاراست و پوزش باعلی
یامحمدؐ جاں فزاید گفتنش — یاعلیؑ مشکل کشاید گفتنش
چوں اعانت خواہی ازیزدان پاک — یامعین الدینؒ اگر گوئی چہ باک
ابلہاں را زانکہ دانش نارسا است — گفتگوہا برسرحرف ندا است
مولوی معنوی عبدالعزیز — داں رفیع الدین دانشمند نیز
شاہ عبدالقادر دانش سگال — کایں دوتن رابود در گوہر ہمال
بردنِ نامِ نبی و اولیا — خود رواگفتند باحرفِ ندا

مولدِ پیغمبر

ورسخن درمولدِ پیغمبر است — بزم گاہِ دلکش وجاں پروراست

موئے مبارک

نکہتِ موئے مبارک جانفزاست با رگِ جانش ہمی پیوند ہاست

عرس وفاتحہ

عرس و ایں شمع وچراغ افروختن عود در مجمر بر آتش سوختن
جمع گشتن در یکے ایواں ہمی پنج آیت خو اندن ازقرآں ہمی
ناں بناں خواہندگاں دادی دگر مردہ را رحمت فرستادی دگر
گرپئے ترویحِ روحِ اولیا ست درحقیقت آں ہم ازبہرِ خداست
اولیا را گر گرامی داشتیم نزپے رومی وشامی داشتیم
از برائے آنکہ ایں آزاد گاں ازرہِ حق جاں بجاناں داد گاں
از شہود حق طرازے داشتند باخدائے خویش رازے داشتند
نورچشمِ آفرنیش بودہ اند شمع روشن ساز بنیش بودہ اند

فیض اولیا

ہست اسمِ خاص در ہر مرز بوم خودچہ می خواہی زنفسِ ایں رسوم
نفیِ اسم کفر باہم می کنیم داد بادانش فراہم می کنیم
نفیِ کفر آئین اربابِ صفا ست نفیِ فیض اے تیرہ دل رسم کجاست
نفیِ رسم ورہ ہوائے می کشد نفیِ فیض است اینکہ مارامی کشد
اے گرفتار خم وپیچ خیال نفیِ بے اثبات نبود جز ضلال
ور تو گوئی می کنم اثباتِ حق ازچہ آئی منکرِ آیات ِ حق؟

معجزات

معجزاتِ انبیا آیاتِ کیست ویں صفت ہاراظہوراز ذات کیست

امکانِ نظیر

ایں کہ می گوئی توانا کردگار چوں محمدؐ دیگرے آرد بکار
با خداوندِ دوگیتی آفریں ممتنع بنود ظہور ایں چنیں
نغز گفتی نغز تر باید شنفت آنکہ پنداری کہ ہست اندرنہفت
گرچہ فخرِ دودۂ آدم بود ہم بقدرِ خاتمیت کم بود
صورتِ آرائش عالم نگر یک مہ ویک مہر یک خاتم نگر
اینکہ می گویم جوابے بیش نیست مہر ومہ زاں جلوہ تابے بیش نیست
آنکہ مہر وماہ واختر آفرید می تواند مہر دیگر آفرید
حق دو مہراز سوئے خاور آورد کور باد آں کونہ باور آورد
قدرتِ حق بیش ازیں ہم بودہ است ہر چہ اندیشی کم ازکم بودہ است
لیک دریک عالم از روئے یقیں خودنمی گنجد دو ختم المرسلینؐ
یک جہاں تاہست یک خاتم بس است قدرتِ حق رانہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرّہ آرد عالمے ہم بود ہر عالمے را خاتمے
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ للعالمینے ہم بود
کثرتِ ابداع عالم خوب تر یا بیک عالم دو خاتم خوب تر
دریکے عالم دو تا خاتم مجوئے صد ہزاراں عالم وخاتم بگوئے
غالبؔ این اندیشہ نپذیرم ہمی خردہ ہم برخو یش می گیرم ہمی
اینکہ ختم المرسلینش خواندۂ دانم از روے یقینش خواندۂ
ایں الف لامے کہ استغراق راست حکم ناطق معنی اطلاق راست
منشاے ایجادِ ہر عالم یکے ست گردوصد عالم بود خاتم یکے است
خودہمی گوئی کہ نورش اوّلست ازہمہ عالم ظہورش اوّلست

اوّلیت را بود شانے تمام   کے بہر فردے پزیرد دا نقسام
جوہرِ گُل بر نتابد تثنیہ   در محمدؐ رہ نیابد تثنیہ
میم امکاں اندر احمد منزویست   چوں ز امکاں بگزری دانی کہ چیست
صانعِ عالم چنیں کرد اختیار   کس بعالم مثل نبود زینہار
ایں نہ عجز است اختیار است اے فقیہ   خواجہ بے ہمّت بود لاریب فیہ
ہر کرا باسایہ نپسند و خدا   ہیچوئے وے نقش کے بندد خدا
ہم اگر مہر منیرش چوں بود   سایہ چوں نبود، نظیرش چوں بود
منفرد اندر کمالِ ذاتی است   لاجرم مثل محالِ ذاتی است
ایں عقیدت بر نگردم والسّلام   نامہ را در می نوردم والسّلام

مشرب

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن   خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں
خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایماں زیستن   حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن
کارے عجب افتادہ بدیں شیفتہ مارا   مومن نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت
ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم   دانی کہ اصلِ گوہرم از دودۂ جم است
میراثِ جم کہ مے بود اینک بمن سپار   زیں پس اسد بہشت کہ میراث آدم است
فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار   ساقی و مغنّی و شرابے و سرودے
زینہا ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بسجودے و نبیؐ را بدودے
درعالم بے زری کہ تلخ است حیات   اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰت
طاعت نتواں کرد بامیدِ نجات   بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰت
درمن ہوس بادہ طبیعی است کہ غالبؔ   پیمانہ بہ جمشید رساند نسیم را

میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔قلندری و آزادی و ایثار و کرم جو دوامی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔نہ وہ طاقت جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں، اور ٹین کا ایک لوٹا معہ سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور با پیادہ چل دوں۔کبھی شیراز جانکلا۔کبھی مصر میں جا ٹھہرا کبھی نجف جا پہنچا۔نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میہمان بن جاؤں۔اگر تمام میں نہ ہو سکے نہ سہی۔جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو ننگا بھوکا نظر نہ آئے۔

اخلاق

میں عربی کا عالم نہیں مگر نرا جاہل بھی نہیں۔بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میری ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔

غالبؔ سوختہ جاں گرچہ نیرزد دبشمار   ہست در بزمِ سخن ہمنفس و ہمدم شاں
غالبؔ زحسرتی چہ سرائی کہ در غزل   چوں او تلاش معنی و مضموں نکرد کس
غالبؔ اگر بہ بزمِ شعر دیر رسید دور نیست   کس بفراقِ حسرتی دل ز سخنوری گرفت
غالبؔ آزردہ سروشیست کہ از مستیِ قرب   ہم بداں وحی کہ آوردہ غزل خواں شدہ است
شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر   خونابہ برخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن   چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

مشاہیر کے متعلق رائے

ز ترک تازیِ آں نازنیں سوار ہنوز
ز سبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

حزیں کے اس مطلع میں ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا۔ حزیں تو آدمی تھا۔ یہ مطلع اگر جبریل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے۔

ایک مرد معوّج الذہن نہ فارسی داں نہ عربی خواں نے میری نگارش قاطع برہان کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی۔ اور محرق قاطع اس کا نام رکھا۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احمق ہے۔ اور جیسا وہ احمق دافعِ ہذیان، سوالات عبدالکریم اور لطائفِ غیبی پڑھ کر بھی متنبہ نہ ہوا اور محرق کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہو، کہ بے حیا بھی ہے۔

(صاحبِ برہان قاطع کے متعلق)

خصوصاً دکنی تو عجب خانہ ہے۔ لغو ہے۔ پوچ ہے۔ پاگل ہے۔ دیوانہ ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ہائے اصلی کیا ہے اور ہائے زائدہ کیا ہے۔

میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسے وہ گھاگھس اُلّو عبدالواسع ہانسوی، لفظ نامراد کو غلط کہتا ہے۔ اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیل۔ صفوتکدہ و شفقت کدہ و نشتر کدہ کو اور ہمہ عالم اور ہمہ جا کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو یک زبان کو غلط کہوں گا۔ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع صاحب فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط۔ ارے تیرا ستیاناس جائے بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔

غالبؔ کا خیال اپنے متعلق

یہاں خدا سے بھی توقع نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالبؔ کے ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ کیا مرا۔ بڑا مرا۔ بڑا مردود مرا۔ بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو جنّت آرام گاہ اور عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہِ قلمروِ سخن کا جانتا تھا۔ ''سقر مقر'' اور ''ہاویہ زاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرض خواہ کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرض خواہ بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب نواب کیسے اوفلاں صاحب۔ آپ سلجوقی افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو رکو۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا۔ بے عزت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا۔

آخری دن

میں اب تنہا عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لبِ بام اور ہجومِ امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ بار خدا ہی چاہیے نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک نشان باقی و قائم رہے گا۔

آخری خوراک

غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی۔ قریب شام کبھی کبھی تین تلے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔

بیماری

ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا حواس مختل ہو گئے۔ ہاتھ میں رعشہ انگلیاں کہنے میں نہیں ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا۔ اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چار پایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن میں دس بار اور اسی قدر رات میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسبابِ حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو خواب نہیں ہوتا۔ بعد ازالہ بول بے توقف نیند آ جاتی ہے۔

تاریخ وفات

آخری عمر میں مالی تکالیف اور جسمانی عوارض سے زیادہ دق ہو گئے تھے۔ اور مرنے کی خواہش کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ نکالی:

کیستم من کہ جاوداں باشم — چون نظیری ، نماند و طالب مرد
وربگویند در کدا میں سال — مُرد غالبؔ بگو کہ غالبؔ مُرد

۱۲۷۷ھ

اتفاق سے اسی سال شہر میں بڑی سخت وبا آئی اور سارا شہر ادھیا سا گیا۔ لیکن غالب اچھے خاصے رہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اکثر خطوں میں اس وبا کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ ''وہ وبا بھی کیسی جس میں ایک بہتّر سال کا بڈھا اور سرسٹھ سال کی بڑھیا نہ مرسکی'' اور خط میں لکھتے ہیں ''میاں ۱۲۷۷ (قطعہ وفات) والی بات غلط نہ تھی مگر میں نے اس وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد دیکھ لیا جائے گا۔'' غالبؔ کا انتقال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ اور ان کے اپنے قطعہ وفات میں اضافہ کے بعد ان کی تاریخ وفات ''آہ بمرد'' سے دستیاب ہوئی۔ اس تاریخ میں اکثر حضرات کو توارد ہوا کیوں کہ ان کی اپنی تاریخ میں صرف آہ اور با کا اضافہ درکار تھا۔

(شش ماہی غالب، ادارہ یادگار غالب کراچی، شمارہ ۱-۲، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۷ء/ ۱۹۸۸ء، ص ۴۳-۵۹)

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ یہ جائداد جسے غالب نے اپنی بتایا ہے، اصل میں ان کے نانا خواجہ میرزا غلام حسین کمیدان کی تھی۔ میرزا غلام حسین سرکار میرٹھ میں فوجی افسر تھے اور آگرہ کے معززین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جس بڑی حویلی کا ذکر غالب نے کیا ہے وہ اب بھی آگرہ میں موجود ہے۔ بڑی شاندار اور عالی شان عمارت ہے۔ آج کل اس میں اندر بھان گرلز ہائی اسکول ہے۔ جس علاقہ کو غالب نے گڈریوں والا کٹرہ کہا ہے وہ آج کل گڈری منصور خاں کہلاتا ہے۔ اور جہاں ان کے زمانے میں کشمیرن والا کٹرہ تھا وہ علاقہ اب کشمیری بازار کے نام سے مشہور ہے۔

فائدہ: غالب کی تاریخ ولادت راقم الحروف نے لفظ بابا سے نکالی ہے۔ ۱۲۱۲ھ۔ حالانکہ لفظ بابا کے کل عدد ۶ ہوتے ہیں۔ تاریخ کا ایک نادر طریقہ یہ ہے کہ تمام حرف برابر برابر رکھے جائیں تو مکمل مطلوبہ سنہ بن جائے۔ یعنی ب ا ب ا ۱۲۱۲ھ۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ نہ ہر سنہ کے ساتھ ممکن ہے نہ ہر لفظ کے ساتھ محض اتفاق سے اس کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اور نادر الوجود سمجھی جاتی ہے میں اس تاریخ کو محض اپنے بزرگوں کا فیضِ روحانی سمجھتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم۔ ۱۲

۲۔ حبس دوام سے مراد شادی اور بیڑی سے مدعا بیوی ہے۔ ۹ر اگست ۱۸۱۰ء کو غالب کی شادی نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کی بھتیجی اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی امراؤ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس وقت غالب کی عمر ۱۳ برس اور امراؤ بیگم کی عمر ۱۱ برس کی تھی۔ امراؤ بیگم نے تقریباً ۷۱ برس کی عمر پاکر ۴ر فروری ۱۸۷۰ء میں انتقال کیا۔ امراؤ بیگم سے غالب کے ۷ اولادیں ہوئیں جن میں سے کوئی زندہ نہ رہی غالبؔ نے نواب زین العابدین خاں عارف کو متبنیٰ کرلیا تھا۔ زین العابدین خاں امراؤ بیگم کی بڑی بہن بنیادی بیگم کے بیٹے تھے۔ غالبؔ زین العابدین خاں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کی جواں مرگی کا قلق غالبؔ کو عمر بھر رہا۔ ہر جگہ غالبؔ نے ان کو اپنا لڑکا

اوران کے دونوں بچوں باقر علی خاں کو اور حسین علی خاں کو اپنا پوتا کہا ہے۔ یہاں بھی دو ہتھکڑیوں
سے مراد یہی دو بچے ہیں۔

نوٹ

غالب نے اپنے مذہبی عقائد کے متعلق نظم ونثر میں اس قدر متضاد اور متباین بیانات دیے ہیں کہ اگر
ان کے سارے اقوال نثر و نظم جمع کر لیے جائیں تو محض ان کی بنا پر غالب کو صوفی و عارف باللہ سے
لے کر نظامی چشتی پیر و مذہب امامیہ مائل بہ تشیع تفضیلی وتبرائی اور دہری سے لے کر ملحد و
کافر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک کسی شخص کی شاعرانہ عظمت یا ادیبانہ منصب کا تعلق ہے
مذہب کسی طرح ابھر کر اس کی پیشانی پر داغ یا ستارہ نہیں بن سکتا۔ مذہب وعقائد کا مطالعہ محض
ادیب وشاعر کی شخصی زندگی کی تصویر مکمل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غالب اپنے عقائد و مذہب میں شیعہ تھے۔ اس کا اعلان وہ زندگی بھر کرتے
رہے اور اسی مسلک پر انھوں نے مرنے کی تمنا بھی کی ان کے متعلق مذہب کا سوال شاید نہ اٹھتا
اگر ان کے انتقال کے بعد حکیم محمود خاں اور ضیاء الدین وعلاء الدین خاں بہ اصرار ان کی تجہیز و
تکفین اہل تسنن کے طریقے پر نہ کرتے۔ چونکہ یہ بزرگ غالب کو زندگی میں بھی بہت عزیز تھے۔
انھوں نے خود ان کی حیات و معاشرت کے ہر گوشے کو بے نقاب دیکھا تھا اور اس لیے بعض طبقوں
میں ان کے عقائد کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا ورنہ ان کو بہت قریب سے دیکھنے والے ہمارے
بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ حالی جو ان کے عزیز شاگرد تھے لکھتے ہیں ''مگر زیادہ ان کا میلان طبع
تشیع کی طرف پایا جاتا تھا۔ جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے
۔'' محمد حسین آزاد نے بھی لکھا ہے کہ ''اہل راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ
تھا۔''

لیکن غالب کا شیعہ ہونا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان کا سارا خاندان سنی تھا۔ ننھیال اور
دوھیال میں سب لوگ سنی تھے۔ شادی لوہارو خاندان میں ہوئی۔ وہ لوگ بھی سنی تھے اس لیے
خیال یہ ہوتا ہے کہ غالب نے یہ عقائد اپنے خاندان سے حاصل نہیں کیے بلکہ اس کے پس منظر میں
دو چیزیں ہیں۔ ایک تو ملا عبدالصمد ایرانی کا اثر۔ جس کے متعلق وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے ابتدائی
عمر میں فارسی ملا عبدالصمد سے پڑھی جو دو برس میرے گھر میں رہا چونکہ اہل ایران کا عام مذہب تشیع

ہے۔ اس لیے قیاس غالب ہے کہ عبدالصمد بھی اسی مذہب کا پابند ہوگا اور چونکہ اس کا اثر غالب
نے کافی گہرا قبول کیا ہے اس لیے عقائد میں بھی اس سے متاثر ہوئے۔ دوسرا پہلو خود ان کی
طبیعت ہے۔ جو روش عام کے ہر انداز سے متنفر اور اپنے لیے الگ راہ نکالنے کے ذریعے ڈھونڈا
کرتی تھی۔ اپنے خاندان کے ماحول کی ساری پابندیاں توڑ کر انھوں نے یہ اثر قبول کر لیا۔
شاید اس میں ان کے لڑکپن کے عشق کو بھی دخل ہو جو غزلیات غالب نے اپنے قلم سے اپنے اولین
مجموعہ میں درج کی ہیں جو وہ یقیناً ۱۶۔۱۷ برس کی عمر سے پہلے پہلے کر چکے تھے۔ اس میں یہ شعر ملتا
ہے:

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خونِ صوفی کو مباح و مالِ سنی کو حلال

یہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ شاعری نہیں۔

غالب نے اپنے زمانے کے بڑے ذہین اور چوکس آدمی تھے۔ اس قدر دقیقہ رس اور
خُردبین شخص ان کے ہم عصروں میں کوئی بھی نہ تھا۔ انسانی فطرت اور نفسیات کی باریکیوں سے بھی
واقف تھے چنانچہ مذہب کو انھوں نے عقبیٰ سے زیادہ دنیا میں ذریعہ نجات بنایا اور جس شخص سے ان
کا کام پڑا اسی شخص کے عقائد کے مطابق انھوں نے اپنے عقائد کو بھی ڈھال کر پیش کیا مثلاً ایک
دلچسپ بات یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ قاطع برہان اور برہان قاطع کے ہنگامے میں مصروف
تھے۔ ان کے مخالفین بڑی شدت سے ان کے خلاف محاذ تیار کر رہے تھے تو ان کو ضرورت تھی کہ چند
سمجھدار اشخاص ان کی تائید میں کچھ لکھیں۔ چنانچہ انھوں نے غلام حسین قدر بلگرامی کو خط لکھا اور ان
سے خواہش کی وہ ان کی تائید میں کچھ لکھیں۔ چونکہ غالب کو بلگرامی سے کام لینا تھا اس لیے ان کی
ہمدردی حاصل کرنے کے لیے مذہبی جذبات کا سہارا لیا اور خط کے آخیر میں۔ ''غالب اثنا عشری
حیدری'' لکھا۔

اسی طرح بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں ان کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے ایک رباعی
گذارتی:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
صوفی کیوں کر ہو جو کہ ہووے دہری   شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

اسی طرح انھوں نے اپنے سنی اور شیعہ دوستوں کو اسی طرح کی تحریریں لکھی ہیں۔ واقعات اور شواہد کی روشنی میں اس پر زیادہ بحث کی گنجائش باقی نہیں ہے کہ حالؔی اور آزاد کے بیانات صحیح ہیں۔ لیکن غالب کی شخصیت بحیثیت انسان اور انسان دوست کے ان کے اِن مذہبی عقائد سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی۔ مذہب اور تصوف کا جو صحیح اور صحت مند اثر ہونا چاہیے وہ غالب پر زیادہ مرتب ہوا ہے۔ یعنی فراخ مشربی، بلند حوصلگی، کشادہ دلی، ہمدردی، بے لوثی، دوست نوازی۔ اقربا پروری۔ دوستوں سے سچی اور بے لاگ محبت جس میں کافر و مسلمان کی تفریق باقی نہیں رہتی۔ دوسروں کے کام آنا اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا۔ آدم کے ہر بیٹے کو صرف انسان کی سطح پر دیکھنا اور اسی طرح اس سے پیش آنا۔ قلب و نظر کی یہ وسعت اور مشرب و مسلک کی یہ فراخی اصل تصوف اور روح مذہب ہے۔ اور یہ غالبؔ کی شخصیت میں زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر موجود تھی۔ بحیثیت انسان کے بھی غالبؔ کی شخصیت اپنے عصر کے دوسرے بیشتر شاعروں میں ممتاز ہے۔

شان الحق حقی

غالبؔ کے دو اور شعر

آہ وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

☆☆☆

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

لفظی تشریح ان اشعار کی سب شرحوں میں ایک سی ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ مولوی محمد باقر نے سب شرحوں کا خلاصہ کر دیا ہے۔ جہاں فرق ہوتا ہے وہ بھی بیان کر دیتے ہیں، مگر یہاں کوئی اختلاف نہیں ہے:

۱۔ پہلے فریاد کی جو جرأت مجھ میں تھی وہ اب نہیں رہی۔ دل کی بے جرأتی و کم طاقتی کو دیکھ کر میں جگر کو یاد کرتا ہوں جس میں کبھی فریاد کرنے کی طاقت دل سے بہت زیادہ تھی، مگر اب جگر میں وہ طاقتِ فریاد نہیں رہی۔ مطلب یہ کہ جگر سلامت ہوتا تو میں خوب نالے کرتا۔ (بیانِ غالب، ص ۱۱۰)

۲۔ تیری نگاہ کا تیر دل کو چیرتا ہوا جگر تک پہنچ گیا۔ چونکہ دل اور جگر دونوں تیر نگاہ سے زخمی ہونے کے آرزومند تھے، لہٰذا وہ دنوں اِس ادا سے خوش ہو گئے۔ (بیانِ غالب، ص ۳۳۵)

لیکن نکتہ جو لائقِ توجہ ہے وہ یہ کہ دل اور جگر غالب کے ہاں۔ ایک دوسرے سے متمیّز

جداگانہ تشخص رکھتے ہیں۔ان کی انفرادیت کواس طرح جتا کر شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے بیان کیا ہو۔ یہ گویا علامات ہیں انسانی شخصیت کے دو جداگانہ عناصر کی۔ایک کو تحمل سے نسبت ہے دوسرے کو تہوّر سے۔ایک طرف انفعالیت، ربودگی،صبر واستقامت ہے۔دوسری طرف بے چینی، بےقراری نالہ وفریاد۔

اوپر کے پہلے شعر کے ساتھ ایک مطلع اور ایک شعر اور ہے جس سے اس نکتے کی مزید تائید ہوتی ہے۔

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

خود دل کو بھی فریاد کے لیے ''جگر تشنہ'' کہا ہے۔گویا فریاد جگر ہی سے مخصوص ہے۔دل انسانی شخصیت یا عاشقانہ کردار کے جن پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے اُن میں احتجاج، مدافعت، کشمکش، برہمی شامل نہیں۔طبی نقطۂ نظر سے جگر کو سودا سے نسبت ہے اور سودا کو اشتعال و برہمی سے جس کا اظہار نالہ وفغاں سے ہوتا ہے۔دل کے ساتھ جگر بھی مٹ گیا تو گویا پوری شخصیت عشق کی گرفت میں آ گئی۔نگاہ دل سے جگر تک اُتری تو گویا اس نے پوری شخصیت کو مطیع کر دیا۔کیا فکر وتخیل جسے دل سے نسبت ہے اور کیا شورشِ جذبات جسے غالب جگر سے منسوب کرتے ہیں اور فریاد وفغاں پر مائل کرتی ہے۔پھر کسی اور حسرت کی گنجایش نہیں رہتی۔خونِ جگر خالصتاً مژگانِ یار کی امانت ہو جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں:

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

مگر یہ منزل بڑی کشمکش کے بعد آتی ہے۔جگر کو یونہی نہیں بلکہ قطرہ قطرہ کر کے خون ہوتا ہے اور بہت کچھ نالہ دفغاں کرتا ہے۔اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

عاشقی صبرِ طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک

یعنی یہ وہ منزل ہے کہ پوری طرح خونِ جگر نہیں ہوا ہے کشمکش باقی ہے۔یہاں بھی عاشقی کی صبر طلبی اور تمنا کی بے تابی الگ الگ دل وجگر سے نسبت رکھتی ہے۔پھر وہ منزل آتی ہے کہ جگر، خون ہو کے بہہ جاتا ہے۔فریاد دفغاں کی سکت باقی نہیں رہتی تو کشمکشِ عاشقی کے پچھلے ہنگامے یاد آتے ہیں:

حیراں ہوں دل کو روؤں کو پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

یہ اُن اشعار میں سے ہے جو تفننِ طبع کے لیے کہے جاتے ہیں،مگر منازلِ عشق اور دل وجگر کے استعارات یا مضمرات جو فکرِ غالب کے مسلمات میں ہیں، یہاں بھی موجود ہیں۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ، نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

مولانا حالی کا قول ہے کہ ''اے'' کی جگہ ''جُز'' رکھ کے پڑھو تو مطلب واضح ہو جائے گا۔اس کے بعد بعض استاد طالب علموں کو ''اے'' کے معنی ''جُز'' بتانے لگے۔میری ناچیز رائے میں اے کی جگہ جُز رکھنے سے مطلب حل نہیں ہوتا، اور نہ اے کلمۂ تخاطب ہے۔نالہ تو سر ہو کے ختم ہو جاتا ہے، کھڑا نہیں رہتا کہ اس سے سوال کیا جائے اور وہ جواب دے۔ہاں ''اے نالہ'' کی جگہ ''اے وائے'' پڑھیے تو مطلب برآمد ہوتا ہے۔''جز نالہ'' تو اے نالہ کا مترادف نہیں۔

اے وائے ''اے نالہ'' کا عین مترادف ہے۔اوراس کی ایمائیت بھی کھل جاتی ہے یعنی صرف نالے کا نام لے کر یہ اشارہ بھی کر دیا گیا کہ جگر کا نشان تو اب وہ نالہ بھی نہیں رہا جس سے اُس کا وجود کا پتا چلتا تھا۔چنانچہ ''اے نالہ'' ہی ''اے وائے'' یا ''جُز نالہ'' سے زیادہ پُر معنی ہے۔اوپر کے اشعار سے واضح ہو چکا ہے کہ جگر کے مٹنے یا خون ہونے کے عشق کی اس منزل پر نالے خاموش ہو جاتے ہیں، کہیں کہیں صرف حسرتِ نالہ نظر آتی ہے۔اے نالہ! بھی نالہ نہیں،

صرف ایک کلمۂ حسرت ہے۔ایک پیرایۂ اظہار جسے فجائیہ کہتے ہیں۔

(شش ماہی غالب،ادارہ یادگارِ غالب کراچی،شمارہ ۳،۴،۵،ص ۱۸۰۔۱۸۲)

ڈاکٹر گیان چند

غالب کے منسوخ کلام میں سے سو منتخب اشعار

ذیل میں غالب کے قلم زد کلام میں سے سو شعروں کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔انھیں دیوانِ غالبؔ،نسخۂ عرشی کے جز وگنجینۂ معنی،طبع اول سے لیا گیا ہے۔جو اشعار دقیق اور بعید الفہم تھے،انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے،خواہ معنی کے لحاظ سے وہ کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں۔انتخاب کو نسبتاً صاف شعروں تک محدود رکھا گیا ہے۔یاد رہے کہ ہر انتخابِ کلام محض شخصی اور ذاتی پسند کی عکاسی کرتا ہے۔

انتخاب قصائد

مجھے بادۂ طرب سے بہ خمار گاہ قسمت
جو ملی تو تلخ کامی، جو ہوئی تو سرگرانی

☆☆☆

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوانِ گفتگو پر دل وجاں کی میہمانی

انتخاب غزلیات

ہے کہاں تمنا کا، دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

☆☆☆

بے دماغِ خجلت ہوں، رشکِ امتحاں تا کے
ایک بیکسی! تجھ کو ، عالم آشنا پایا

☆☆☆

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

☆☆☆

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن
ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

☆☆☆

بہ صورت تکلف ، بہ معنی تاسف
اسدؔ! میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

☆☆☆

تا کجا افسوس گرمی ہائے صحبت اے خیال
دل بہ سوزِ آتشِ داغِ تمنا جل گیا

☆☆☆

اے آہ ! میری خاطرِ وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

☆☆☆

کل اسدؔ کو ہم نے دیکھا گوشۂ غم خانہ میں
دست برسر، سر بہ زانوے دلِ مایوس تھا

☆☆☆

اسدؔ! خاکِ درِ مے خانہ اب سر پر اڑاتا ہوں
گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے سے زانو زانو تھا

☆☆☆

عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے
رفوے زخم کرتی ہے بہ نوکِ نیش عقرب ہا

☆☆☆

سروکارِ تواضع تاخمِ گیسو رسا نیدن
بسانِ شانۂ زینت ریز ہے دستِ سلام اس کا

☆☆☆

اسد سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اس کا ، ابر بے پروا خرام اس کا

☆☆☆

آخر کار، گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

☆☆☆

شکوۂ یاراں ،غبار دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

☆☆☆

عکسِ رخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ
شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا

☆☆☆

مہر بجائے نامہ لگائی برلبِ پیکِ نامہ رساں
قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

☆☆☆

پھر وہ سوئے چمن کو آتا ہے، خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

☆☆☆

حیرتِ اندازِ رہبر ہے عناں گیر اے اسدؔ
نقشِ پائے خضر یاں، سدِّ سکندر ہوگیا

☆☆☆

دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا
کہ شب خیال میں بوسوں کا اِزدحام رہا

☆☆☆

لغزشِ مستانہ وجوش تماشا ہے، اسدؔ
آتشِ مے سے بہارِ گرمیِ بازارِ دوست

☆☆☆

دودِ شمع کشتۂ گل بزم سامانی عبث
یک شبہ آشفتہ نازِ سنبلستانی عبث

☆☆☆

جب کہ نقشِ مدّعا ہووے نہ جز موجِ سراب
وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

☆☆☆

اے اسدؔ ! بے جا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث

☆☆☆

کرتی ہے عاجزی سفرِ سوختن تمام
پیراہنِ خسک میں غبارِ شرر ہے آج

☆☆☆

شاخِ گُل جنبش میں ہے گہوارہ آسا ہر نفس
طفلِ شوخِ غنچۂ گل بسکہ ہے وحشت مزاج

☆☆☆

سَیرِ ملکِ حسن کر مے خانہ ہا نذرِ خمار
چشمِ مستِ یار سے ہے گردنِ مینا پہ باج

☆☆☆

خمارِ منتِ ساقی اگر یہی ہے اسدؔ
دلِ گداختہ کے مے کدے میں ساغر کھینچ

☆☆☆

بزمِ نظر ہیں بیضۂ طاؤس خلوتاں
فرشِ طرب بہ گلشنِ نا آفریدہ کھینچ

☆☆☆

قطعِ سفر، ہستی و آرامِ فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ

☆☆☆

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا

سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

☆☆☆

جوابِ سنگ دلی ہائے دشمناں ہمت

زدستِ شیشۂ دل ہائے دوستاں فریاد

☆☆☆

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ

متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

☆☆☆

لکھی یاروں کی بدمستی نے مے خانے کی پامالی

ہوتی قطرہ فشانی ہائے مے، بارانِ سنگ آخر

☆☆☆

دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے

دشمنی ہے ، وصال کا مذکور

☆☆☆

ہجوم فکر سے دل مثلِ موج لرزاں ہے

کہ شیشہ نازک و صہبائے[1] آبگینہ گداز

☆☆☆

اسدؔ سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے

کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز

☆☆☆

گُل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی

سرخوش خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

☆☆☆

آشنا ، غالب ! نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا

ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ استماع

☆☆☆

ہوتے ہیں محو جلوۂ خور سے ستارگاں

دیکھ اس کو ،دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

☆☆☆

کون آیا جو چمن بے تابِ استقبال ہے

جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیِ رفتارِ باغ

☆☆☆

میں دور گردِ عرضِ رسوم نیاز ہوں

دشمن سمجھ، ولے نگہِ آشنا نہ مانگ

☆☆☆

بدر ہے آئینہ طاقِ ہلال

غافلاں! نقصاں سے پیدا ہے کمال

☆☆☆

ہوں بہ وحشت انتظار آوارۂ دشتِ خیال

اک سفیدی مارتی ہے دور سے چشمِ غزال

☆☆☆

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

☆☆☆

کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسؔد
اب کے بہار کا یونہی گزرا برس تمام

☆☆☆

کسو کو زخود رفتہ کم دیکھتے ہیں
کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں

☆☆☆

ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحب دولتاں
ہے زرِ گُل بھی نظر میں جوہرِ فولاد ، یاں

☆☆☆

جنبش دل سے ہوئے ہیں عقدہ ہائے کار، وا
کمتریں مزدورِ سنگیں دست ہے فرہاد، یاں

☆☆☆

وقت ہے، گر بلبل مسکیں زلیخائی کرے
یوسفِ گُل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن

☆☆☆

دیرو و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
وا ماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

☆☆☆

ہے جنبشِ زباں بہ دہن سخت ناگوار
خونابۂ ہلاہلِ حسرت چشیدہ ہوں

☆☆☆

ہوں گرمیِ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

☆☆☆

شمع ہوں لیکن بہ پاور رفتہ خارِ جستجو
مدعا گم کردہ، ہر سو، ہر طرف جلتا ہوں میں

☆☆☆

ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ ہریک عضوِ تن
جوں چراغانِ دوا صف بہ صف جلتا ہوں میں

☆☆☆

خیالِ سادگی ہائے تصور نقشِ حیرت ہے
پرِ عنقا پہ رنگِ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں

☆☆☆

کس کو دوں یارب! حسابِ سوز نا کی ہائے دل
آمدورفتِ نفس جز شعلہ پیمائی نہیں

☆☆☆

امیدوار ہوں تاثیرِ تلخ کامی سے
کہ قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرّر ہو

☆☆☆

زلفِ خیال نازک و اظہار بے قرار
یارب! بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

☆☆☆

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گردانده

☆☆☆

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت و بیاں
ہے سخن گرد ز دامانِ ضمیر افشاندہ

☆☆☆

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد،جہاں میں ورق ناخواندہ

☆☆☆

نے سرو برگِ آرزو، نے رہ ورسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق، تو!ہم کو بھی آشنا سمجھ

☆☆☆

کیا پوچھے ہے بر خود غلطی ہائے عزیزاں
خواری کو بھی اک عار ہے عالی نسبوں سے

☆☆☆

طرفِ سخن نہیں ہے مجھ سے، خدا نہ کردہ
ہے نامہ بر کو اس سے دعوائے ہم کلامی

☆☆☆

عروجِ نشہ ہے سرتاقدم،قدِّ چمن رویاں
بجائے خود ، وگرنہ سرو بھی مینائے خالی ہے

☆☆☆

اسدؔ! اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

☆☆☆

یوں بعدِ ضبطِ اشک،پھروں گرد یار کے
پانی پیے، کسو پہ کوئی جیسے وار کے

☆☆☆

ہم، مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجرسے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

☆☆☆

اسدؔ! جمعیتِ دل در کنارِ بے خودی خوشتر
دو عالم آگہی، سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

☆☆☆

وقت اس افتادہ کا خوش جو قناعت سے اسدؔ
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے

☆☆☆

وصل میں دل انتظار طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ، تاراجِ تمنا کے لیے درکار ہے

☆☆☆

اسدؔ، یاس تمنا سے نہ رکھ امیدِ آزادی
گدا زہرِ تمنا، آبیارِ صد تمنا ہے[2]

☆☆☆

اسدؔ ! بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سروقامت ہے

☆☆☆

لطفِ عشق ہریک، اندازِ دگر دکھلائے گا
بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہوجایئے

☆☆☆

بزم ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدؔ
دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ سے

☆☆☆

یارب! ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

☆☆☆

کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے
ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے

☆☆☆

پر افشاں ہوگئے شعلے ہزاروں
رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے

☆☆☆

رشک ہے آسایشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

☆☆☆

رچ گیا جوشِ صفا[3] سے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ، اے ظالم! سِیہ فامی تری

☆☆☆

محیطِ دہر میں بالیدن از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہریک[4]، حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

☆☆☆

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

☆☆☆

زباں سے عرضِ تمنائے خامشی معلوم
مگر وہ خانہ بر اندازِ گفتگو جانے

☆☆☆

ساقیا! دے ایک ہی ساغر میں سب کو مے کہ آج
آرزوئے بوسۂ لب ہائے میگوں ہے مجھے

☆☆☆

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوّابی کرے

☆☆☆

صبح سے معلوم آثار ظہور شام ہے
غافلاں! آغازِ کار، آئینۂ انجام ہے

☆☆☆

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام وسبو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

☆☆☆

جس طرف سے آئے ہیں، آخر اُدھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم پیمودہ ہے

☆☆☆

تاچند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع ، دل بہ خلوت جانانہ کھینچیے

☆☆☆

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

☆☆☆

نہ حیرت چشمِ ساقی کی، نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں غالبؔ! گردشِ افلاک باقی ہے

☆☆☆

ہزار قافلۂ آرزو بیاباں مرگ
ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خود آرائی

☆☆☆

اے بے ثمراں! حاصلِ تکلیفِ د میدن
گردن، بہ تماشائے گُل ، افراختنی ہے

☆☆☆

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

☆☆☆

پری بہ شیشہ عکسِ رخ اندر آئینہ
نگاہِ حیرتِ مشاطہ، خوں فشاں تجھ سے

☆☆☆

چمن چمن گُلِ آئینہ درکنارِ ہوس
امید، محوِ تماشاے گلستاں تجھ سے

☆☆☆

نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے
تماشا[۵] ہے کہ رنگ رفتہ برگردیدنی جانے

☆☆☆

اسدؔ! جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبان ہر سرِ مو، حالِ دل پرسیدنی جانے

(شش ماہی غالب، ادارہ یادگار غالب کراچی، شمارہ ۳، ۴، ۵، ص ۲۰۱۔۲۱۲)

حواشی

۱تا۵ نسخۂ عرشی کے متن میں ان مقامات پر نسخۂ بھوپال کا متن دیا ہے اور بعد کے نسخۂ شیرانی کا اختلافِ نسخ میں ۔ تدوین کا مسلمہ اصول ہے کہ مصنف کی زندگی کا بعد کا نسخہ پیشتر کے نسخے پر ترجیح رکھتا ہے اسی وجہ سے میں نے ان مقامات پر اختلافِ نسخ سے لے کر نسخۂ شیرانی کا متن دیا ہے۔

سید قدرت نقوی

انتخابِ دیوانِ غالب

از مولانا امتیاز علی عرشی

یہ انتخاب غالبؔ کے اس کلام پر مبنی ہے جسے غالب نے نظری قرار دے دیا تھا۔ یہ کلام نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی، گلِ رعنا کے علاوہ دیگر مخطوطات میں پایا گیا۔ یہ تمام کلام مطبوعہ دیوانِ غالب میں موجود نہیں ہے۔ مولانا عرشی نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب میں اس کلام کو ''گنجینۂ معنی'' کا عنوان دیا ہے۔

میری مولانا سے خط و کتابت جولائی ۱۹۵۷ء میں شروع ہوئی تھی۔ ابتدا خطوطِ غالب کے متعلق کچھ امور کی تصدیق اور کچھ کتابوں کی ترسیل کی گزارش سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ بات دیوانِ غالب تک پہنچ گئی۔ میں مولانا کو غالب کی غزلیات و اشعار وغیرہ بھیجتا رہا جس کو انھوں نے بڑی پذیرائی کی اور فرمائش کی کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ میں نے کچھ کچھ کلام ان کے صاحبزادے اکبر علی خاں کو بھیج دیا اور مولانا عرشی کی خدمت میں لکھا کہ اسے دیوان میں شامل کرلیں۔ مولانا نے ۲۳/اپریل ۱۹۶۲ء کو لکھا:

> ''دیوانِ غالب کا دوسرا اایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ آپ اپنی تجاویز بہ تفصیل لکھ بھیجیے اور جو کوتاہیاں نظر میں آئی ہوں وہ بھی ایک ایک کر کے بتایئے تاکہ نقش ثانی اسم با مسمّٰی ہو جائے۔''

میں نے مئی میں مولانا کو ایک خط لکھ کر کچھ باتیں دیوانِ غالب کے متعلق تحریر کیں۔

''آپ کا مرتبہ دیوان حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ کئی دوستوں کو ہندوستان بھی لکھا مگر نہ ملا پچھلے دنوں ایک صاحب سے اتفاقاً مل گیا تھا مگر انھوں نے ہفتہ عشرہ سے زیادہ میرے پاس رہنے نہ دیا، اسی زمانے میں آپ کو خط لکھا اب ان صاحب سے مسلسل درخواست کر رہا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ ان کا کوئی عزیز لاہور لے گیا ہے۔ دیکھیے کب آئے اور کب میں اس کے متعلق آپ کو تحریر کروں؟ ویسے میرے حافظہ میں یہ امور ہیں کہ بعض مقامات پر املا کی غلطیاں تھیں، بعض امور نسخۂ حمیدیہ کے متعلق آپ نے سہواً لکھ دیے ہیں، یعنی وہ نسخۂ حمیدیہ میں ہیں اور آپ نے لکھ دیا ہے کہ نہیں ہیں۔ اختلاف نسخ میں بھی بعض باتیں رہ گئی ہیں۔ دو غزلیں جو دیوان میں نہیں ہیں، میں نے اکبر علی خاں صاحب کے پاس بھیجی تھیں۔ امید ہے کہ وہ شامل کر لی گئی ہوں گی۔''

بڑی مشکل سے دیوانِ غالب حاصل کیا اور اس سے متعلق یادداشتیں ایک بیاض میں لکھتا رہا۔ مولانا کو بھی اس کی اطلاع دے دی تھی۔ مرحوم نے ۱۲ر ستمبر ۱۹۶۷ء کو لکھا کہ بیاض فوراً بھیج دوں تا کہ دورانِ طباعت میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ میں نے ۲۰ر ستمبر کو جواب دیا کہ بیاض ایک دو روز میں بھیج دوں گا۔ میں نے بیاض ان کی خدمت میں بھیج دی۔ مولانا نے بیاض میں جن امور سے انھیں اتفاق تھا ان پر ٹک مارک (✓) کا نشان لگا دیا۔ تقریباً ستر سے زیادہ ایسے مقامات ہیں جن سے مولانا نے اتفاق کیا ہے۔ اشعار کے اخراج و اندراج کا معاملہ الگ ہے لیکن نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں میری سعیٔ و استعانت کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔ آیندہ صحبت میں اس بیاض کی مدد سے دیوان پر روشنی ڈالی جائے گی۔

میں نے مولانا کی خدمت میں ان کے مرتبہ دیوانِ غالب کے ''گنجینۂ معنی'' کے انتخاب کی فرمائش کی۔ میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس غرض سے ''مجلس غالب'' ملتان میں قائم کی مگر ساتھی کارکن نہ ملنے کی وجہ سے کام آگے نہ بڑھ سکا۔ اسی

سلسلے کی ایک کڑی دیوانِ غالب کا عمدہ انتخاب بھی شائع کرنے کا پروگرام تھا۔ میں نے خود بھی ایک انتخاب تیار کیا تھا۔ مولانا مہر اور مولانا عرشی سے بھی انتخاب کی درخواست کی۔ مولانا مہر سے متداول دیوان کے اور مولانا عرشی سے ''گنجینۂ معنی'' کے انتخاب کے لیے عرض کیا۔ مولانا مہر نے خاموشی اختیار کر لی۔ مولانا عرشی نے درخواست قبول کر کے انتخاب ارسال کیا۔ میں نے یہ درخواست ۱۷ر نومبر ۱۹۶۶ء کو خط میں کی تھی۔

''آپ گنجینۂ معنی سے اشعار کا انتخاب فرما دیجیے۔ یہ انتخاب فروری ۱۹۶۷ء تک چھپ جانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ اپنا انتخاب اگر جلد سے جلد ارسال فرما دیں تو عنایت ہو۔''

مولانا میرا خط رکھ کر کہیں بھول گئے۔ مل جانے پر اس کا جواب ۱۷ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو یہ دیا:

''گنجینۂ معنی کا انتخاب آخر دسمبر تک ارسال کروں گا۔ مگر آپ ایک بار مجھے متنبہ ضرور فرما دیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں بھول جاؤں۔''

میں نے ۲۳ر دسمبر کو خط لکھا جس میں یاد دہانی کے طور پر لکھا:

''یہ خط صرف ''گنجینۂ معنی'' کے انتخاب کی عرضداشت میں لکھ رہا ہوں۔''

جواب نہ ملنے پر میں نے ۲۹ر جنوری ۱۹۶۷ء کو پھر لکھا:

''دسمبر میں خط لکھا تھا کہ آپ ''گنجینۂ معنی'' کا انتخاب عطا فرمائیے۔ اب پھر انتخاب کے لیے چشم براہ ہوں۔''

مولانا نے انتخاب ۳۱ر جنوری ۱۹۶۷ء کو ارسال کرتے ہوئے دو خط لکھے۔ ایک انتخاب کے ساتھ اور ایک الگ کارڈ۔ دونوں میں انتخاب کے متعلق لکھا:

''حسب فرمائش گنجینۂ معنی کا انتخاب بھیج رہا ہوں۔ تاخیر کو معاف فرمائیے گا۔ میں نے وہ شعر انتخاب کرنا چاہے ہیں، جن میں لفظ و معنی دونوں میں فکر و گوش کے لیے کچھ نہ کچھ لذت محسوس ہوتی ہے۔ بہت سے شعروں میں صرف ایک مصرع اس

معیار پر پورا اترتا تھا۔ میں نے اس پورے شعر کو لے لیا ہے۔ اگر کہیں اس اصول سے صرفِ نظر محسوس ہو تو آپ اسے پیری پر محمول فرمائیے گا۔

اچھا یہ ہو کہ آپ بھی ''گنجینۂ معنی'' پر نظر ڈال لیں اور جو شعر مجھ سے چھوٹ گئے ہوں انھیں شامل کر لیں۔ سرورق پر میرا اور آپ کا دونوں کا نام ہونا ضروری ہے تاکہ صرف میں ہی اربابِ ذوق کا ہدف نہ بنوں۔''

کارڈ میں صرف اطلاع ترسیل تھی اور کوئی مزید بات نہیں، میں نے ۷؍فروری کو انتخاب وصول پانے کی اطلاع دی اور لکھا:

''کل رجسٹری سے انتخاب اور آج کا کارڈ ملا۔ انتخاب ارسالِ خدمت ہے۔ عنایت کا شکریہ! چند امور اجازت طلب ہیں۔

۱۔ انتخاب اور متداول یک جا چھپے گا اور بھی کئی حضرات کا مسودہ شامل ہے جن کی عنایت کا ذکر دیباچہ میں کیا جائے گا۔

۲۔ اگر یہ انتخاب بطور ضمیمہ شائع کیا گیا تو مرتبین میں جناب کا اسمِ گرامی شامل ہوگا، بلکہ سرِفہرست۔

میں نے اپنے طور پر بھی انتخاب نسخۂ حمیدیہ کو رکھا ہے۔ ردیف لام تک اس کی متداول کے ساتھ کتابت ہو چکی ہے۔ مولانا مہر کا اصرار ہے کہ حمیدیہ اور متفرق کلام کا انتخاب بطور ضمیمہ شامل کیا جائے۔ میں یک جا رکھنا چاہتا ہوں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں آپ کے انتخاب سے فائدہ اٹھانا مقصود ہے۔ مندرجہ بالا صورتوں میں اندراج کی اجازت عطا کر دی جائے تو انتخاب واپس فرما کر شکرگزار فرمائیے۔

زحمت کے لیے عفو خواہ ہوں اور عنایت کے لیے سراپا سپاس۔ یہ امر اس لیے خدمتِ عالی میں عرض کیا کہ آئندہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو مزاجِ گرامی کے مطابق نہ ہو اور میں خجلت میں مبتلا نہ ہوؤں۔''

مولانا نے جواب میں انتخاب دوبارہ ارسال کر دیا جس کا شکریہ میں نے ۳؍مارچ کے

خط میں ادا کر دیا۔ مولانا نے دیوان پر نشان لگا کر کسی خوش نویس سے نقل کرایا۔ انتخاب نقل ہونے کے بعد اس پر نظر ڈالی تو کئی مقامات پر اپنے قلم سے اشعار اضافہ کیا۔ آخر میں وہ رباعیاں خود لکھی ہیں جو کاتب نے نقل نہیں کی تھیں۔ آخر میں اپنے دستخط مع تاریخ کیے۔ یہ انتخاب پیشِ خدمت ہے۔ مولانا کے قلم سے اضافوں کی نشاندہی حاشیہ میں کر دی گئی ہے۔

چند ضروری وضاحتیں:

۱۔ اشعار میں املا مولانا عرشی کی اختیار کردہ ہے۔

۲۔ یہ انتخاب دیوان غالب مرتبہ مولانا عرشی کے حصہ اول بعنوان ''گنجینۂ معنی'' کا ہے۔

۳۔ اشعار کے درمیان میں نمبر قصائد غزلیات و رباعیات کے ہیں جنھیں قوسین میں لکھا ہے۔ مولانا نے یہ ترتیب انتخاب کے نمبر لکھے ہیں۔

۴۔ انتخاب کے آخر میں مولانا نے دستخط کے بعد ۳۱؍جنوری ۱۹۶۷ء تاریخ لکھی ہے۔

قصائد

اے خوشا فیضِ ہوای چمنِ نشوونما (۱) بادہ پر زور و نفس مست و مسیحا بیمار
ہر کف خاک، جگر تشنۂ صد رنگ ظہور غنچے کے میکدے میں مستِ تامل ہے، بہار
کس قدر عرض کروں ساغرِ شبنم یارب؟ موجۂ سبزۂ نوخیز، ہے، لبریزِ خمار
ہے نفسؔ مایۂ شوقِ دو جہاں ریگ رواں پای رفتار کم و حسرتِ جولاں بسیار
یاں تک انصاف نوازی کہ اگر ریزۂ سنگ بے خبر دے بکفِ پای مسافر آزار
یک بیاباں تپشِ بالِ شرر سے، صحرا مغز کہسار میں کرتا ہے فرو، نشتر خار
فرش اس دشتِ تمنا میں نہ ہوتا، گر عدل گرمیِ شعلہ رُفتار سے جلتے خس و خار
ابرِ تیساں سے ملے موجِ گہر کا تاواں خلوتِ آبلہ میں گم کرے، گر تو رفتار
ناز پر[1] وردۂ صد رنگ تمنا ہوں، ولے پرورش پائی ہے، جوں غنچہ بخونِ اظہار
شعلہ آغاز، ولے حیرتِ داغِ انجام موج می، لیک زسر تا قدم آغوش خمار
ہے اسیرِ ستم کشمکش دامِ وفا دل وارستۂ ہفتاد و دوملت بیزار
موج خمیازۂ یک نشہ، چہ اسلام چہ کفر (۲) کجیِ یک خطِ مسطر، چہ تو ہم چہ یقیں
نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیّر، نہ نگاہ گردِ جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں
رنجِ تعظیم مسیحا نہیں اٹھتا مجھ سے درد ہوتا ہے مرے دل میں جو توڑوں بالیں
بفریبِ آشنائی، بخیال بے وفائی (۳) نہ رکھ آپ سے تعلق مگر ایک بدگمانی
بفراز گاہِ عبرت، چہ بہار و کو تماشا؟ کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزای زندگانی
بفراقِ رفتہ یاراں، خط وحرف، مو پریشاں دل غافل از حقیقت، ہمہ ذوقِ قصّہ خوانی

[1] یہ شعر مولانا نے اپنے قلم سے اضافہ کیا ہے۔

نہ وفا کو آبرو ہے، نہ جفا تمیز جو ہے چہ حسابِ جانشفانی؟ چہ غرورِ دلستانی
مجھے انتعاشِ غم نے پےِ عرضِ حال بخشی ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی
دل نا امید کیونکر بہ تسلی آشنا ہو جو امیدوار رہیے نہ بمرگ ناگہانی
مجھے بادۂ طرب سے بخمارگاہِ قسمت جو ملی تو تلخ کامی، جو ہوئی تو سرگرانی
نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہ ہاں تھی مجھے طاقت آزمائی، تجھے الفت آزمانی
کروں عذرِ ترک صحبت سو کہاں وہ بے دماغی؟ نہ غرورِ میرزائی نہ فریبِ ناتوانی

غزلیات

فضای خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا (۱) فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل پسند آیا
روانیہای موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے کہ لطفِ بے تحاشا رفتنِ قاتل پسند آیا
اسدؔ، ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے مجھے رنگِ بہار ایجادی بیدلؔ پسند آیا
تنگی رفیق رہ تھی، عدم یا وجود تھا (۲) میرا سفر، بطالعِ چشم حسود تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل مگر کس کو دماغِ منتِ گفت وشنود تھا
خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ سرتا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم، یا رب؟ (۳) ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
بے دماغ خجلت ہوں، رشکِ امتحاں تا کے؟ ایک بیکسی، تجھ کو عالم آشنا پایا
فکرِ نالہ میں گویا حلقہ ہوں زسر تا پا عضو عضو، جوں زنجیر، یک دلِ صدا پایا
شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اس کا صبح موجۂ گل کو نقش بوریا پایا
کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا (۴) میری قسمت کا نہ اک آدھ گریباں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا میرے سینے میں، لیکن آخر جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا
کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب! نقش ہر ذرّہ، سویدای بیاباں نکلا

شور[۱] رسوائی دل دیکھ کہ اک نالۂ شوق   لاکھ پردے میں چھپا، پر وہی عریاں نکلا

شوخیِ رنگ حنا، خونِ وفا سے کب تک؟   آخر اے عہدِ شکن، تو بھی پشیماں نکلا

میں بھی معذورِ جنوں ہوں، اسدؔ اے خانہ خراب   پیشوا لینے مجھے گھر سے بیاباں نکلا

وسعت رحمت حق دیکھ کہ بخشا جا وے (۵) مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

شب اختر، قدحِ عیش نے محمل باندھا (۶) بارِ یک قافلۂ آبلہ منزل باندھا

ناتوانی، ہے تماشائی عمرِ رفتہ   رنگ نے آئینہ آنکھوں کے مقابل باندھا

اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ   جو گرہ آپ[۲] نہ کھولی، اسے مشکل باندھا

یار نے تشنگی شوق کے مضموں چاہے   ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

شب کو ذوقِ گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا (۷) شوخی وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

واں ہجومِ نغمہ ہای سازِ عشرت تھا اسدؔ   ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس، مضراب تھا

نظر بازی، طلسم وحشت آبادِ پریشاں ہے (۸) رہا بیگانۂ تاثیر، افسوں آشنائی کا

نہ پایا دردِ مندِ دوریِ یارانِ یک دل نے   سوادِ خطِ پیشانی سے نسخہ مومیائی کا

اسدؔ یہ عجز و بیسامانیِ فرعون تو اَم ہے   جسے تو بندگی کہتا ہے دعوا[۳] ہے خدائی کا

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں، شمع (۹) شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا؟ (۱۰) ہر برگِ گل کے پردے میں دل بیقرار تھا

کس کا جنونِ دید، تمنا شکار تھا؟   آئینہ خانہ، وادیِ جوہر غبار تھا

صبح[۴] قیامت ایک دُمِ گرگ تھی، اسدؔ   جس دشت میں وہ شوخِ دو عالم شکار تھا

---

۱ کاتب نے غلط لفظ لکھ دیا تھا جسے کاٹ کر مولانا نے ''شور'' لکھا۔

۲ کاتب نے آنکھ لکھا تھا۔ مولانا نے ''آنکھ'' کاٹ کر اُوپر ''پ'' بنا دیا۔

۳ کاتب نے ''دعوی'' لکھا تھا۔ مولانا نے ''ی'' کاٹ دیا اور الف بڑھا کر ''دعوا'' بنا دیا۔

۴ اس سے پہلے یہ شعر کاتب نے لکھا تھا جسے مولانا نے قلم زد کر دیا۔

جوں غنچہ و گل آفتِ خالی نظر نہ پوچھ   پیکاں سے تیرے جلوۂ زخم آشکار تھا

نگاہِ چشم حاسد دام لے، اے ذوقِ خود بینی (۱۱) تماشائی ہوں، وحدت خانۂ آئینہ دل کا

شرر فرصت نگہِ، سامانِ یک عالم چراغاں ہے   بقدرِ رنگ، یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ   عصائی خضرؔ صحرای سخن ہے، خامہ بیدلؔ کا

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن (۱۲) ارادہ ہوں، یک عالم افسردگاں

بصورت تکلّف، بمعنی تاسف   اسدؔ میں تبّسم ہوں پژمردگاں کا

ضعفِ جنوں کو وقت تپش، در بھی دور تھا (۱۳) اک، گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

اے وای غفلتِ نگہ شوق! ورنہ یاں   ہر پارہ سنگِ لختِ دلِ کوہِ طور تھا

ہر رنگ میں جلا اسدِؔ فتنہ انتظار   پروانۂ تجلیِ شمع ظہور تھا

خود پرستی سے رہے با ہم دگر نا آشنا (۱۴) بیکسی[۱] میری شریک آئینہ تیرا آشنا

بے دماغی، شکوہ سنج رشک ہم دیگر نہیں   یار تیرا جامِ می، خمیازہ میرا آشنا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزای بہار   سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

گروہ مستِ ناز دیوے گا صلای عرضِ حال (۱۵) خارِ گل، بہر دہانِ گل زباں ہوجائے گا

اے آہ، میری خاطرِ وابستہ کے سوا (۱۶) دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

ہر چند ہوں میں طوطیِ شیریں سخن ولے   آئینہ، آہ میرے مقابل نہیں رہا

کل اسدؔ کو ہم نے دیکھا گوشۂ غم خانہ میں (۱۷) دست برسر، سر[۲] بزانوے دلِ مایوس تھا

نہیں[۳] ہے بازگشتِ سیل غیراز جانبِ دریا (۱۸) ہمیشہ دیدۂ گریاں کو آبِ رفتہ در جو تھا

اسدؔ خاک در میخانہ اب سر پرَ اُڑاتا ہوں   گئے وہ دن کہ پانی جامِ می سے زانو زانو تھا

کرے گر فکرِ تعمیر خرابی ہاے دل، گردوں (۱۹) نہ نکلے خشت مثلِ استخواں، بیروں زقالب ہا

عیاد تہای طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے   رفو سے زخم کرتی ہے، بنوکِ نیشِ عقرب ہا

اسدؔ کو بت پرستی سے غرض دردِ آشنائی ہے   نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

---

۱ یہاں کاتب نے ''میں'' زائد لکھ دیا تھا جسے مولانا نے کاٹ دیا۔

۲ ''بزانوی'' کاتب نے لکھا تھا، مولانا نے ''بزانوے'' کر دیا۔

۳ یہ شعر بقلم مولانا اضافہ ہیں۔

مسی آلود ہے مُہر نوازشنامہ پیدا ہے (۲۰) کہ داغِ آرزوے بوسہ دیوے گا پیام اس کا

بہ[1] امیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کش حسرت — مبادا ہو عناں گیرِ تغافل، لطفِ عام اس کا

عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا (۲۱) ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا

آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا — دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

شوق سامانِ فضولی ہے، وگرنہ غالبؔ — ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

درد کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی (۲۲) وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہوگیا — تو کہے، صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

دیکھ اس کے ساعدِ سیمین و دستِ پُرنگار — شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمعِ گل پروانہ تھا

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کردیا — غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

نہ بخشی فرصتِ یک شبنمستاں جلوۂ خور نے (۲۳) تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

اے آبلے، کرم کر، یاں رنجہ یک قدم کر (۲۴) اے نورِ چشمِ وحشت، اے یادگارِ صحرا

وحشت[2] اگر رسا ہے بے حاصلی ادا ہے — پیمانۂ ہوا ہے، مشتِ غبارِ صحرا

دیوانگی اسد کی حسرت کشِ طرب ہے — درسرِ ہوای گلشن دل میں غبارِ صحرا

مُہر بجای نامہ لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں (۲۵) قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

عیادت سے اسدؔ میں بیشتر بیمار رہتا ہوں (۲۶) سبب ہے، ناخنِ دخلِ عزیزاں سینہ خستن کا

اے خوشا ذوقِ تمنای شہادت کہ اسدؔ (۲۷) بے تکلف بسجودِ خمِ شمشیر آیا

سیرِ آنسوے تماشا ہے طلب گاروں کا (۲۸) خضرؔ مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

داد خواہِ تپش و مُہر خموشی بر لب — کاغذِ سرمہ ہے جامہ تیرے بیماروں کا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے! — رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

---

۱ یہ شعر بقلم مولانا اضافہ ہیں۔

۲ یہ شعر بھی مولانا نے اضافہ کیا ہے۔ اس پر ''مقدم'' اور دوسرے شعر پر ''موخر'' لکھا ہے۔

اسدؔ اے ہرزہ درا نالہ بغوغا تا چند — حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

بجای غنچہ وگل ہے ہجومِ خار وخس، یاں تک (۲۹) کہ صرف بخیۂ دامن ہوا ہے خندہ گلچیں کا

نصیبِ آستیں ہے، حاصلِ روے عرق آگیں — چُنے ہے کہکشاں خرمن سے مہ کے خوشہ پرویں کا

اسدؔ اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں — سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاقِ تحسیں کا

وقتِ شب اس شمع رو کے شعلۂ آواز پر (۳۰) گوشِ نسریں عارضاں، پروانۂ محفل ہوا

عیب کا دریافت کرنا ہے ہُنر مندی اسدؔ — نقص پر اپنے ہوا، جو مطّلع کامل ہوا

ہے تنگ، زِ واماندہ شدن، حوصلۂ پا (۳۱) جو اشک گرا خاک میں ہے، آبلۂ پا

فریاد سے پیدا ہے اسدؔ گرمیِ وحشت — تبخالۂ لب، ہے جرسِ آبلۂ پا

بسکہ وقتِ گریہ نکلا تیرہ کاری کا غبار (۳۲) دامنِ آلودۂ عصیاں گراں تر ہوگیا

حیرتِ اندازِ رہبر ہے عیاں گیر اے اسدؔ — نقشِ پای خضرؔ یاں سدِ سکندر ہوگیا

عروجِ ناامیدی، چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے؟ (۳۳) بہارِ بے خزاں، از آہ بے تاثیر ہے پیدا

دل وجگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے (۳۴) ولے ہنوز خیالِ وصالِ خام رہا

دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا؟ — کہ شب خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا

نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا غالبؔ — خیالِ زلف ورخِ دوست صبح و شام رہا

اسدؔ مایوس مت ہو گر چہ رونے میں اثر کم ہے (۳۵) کہ غالب ہے کہ بعد از زاری بسیار ہو پیدا

تیرگی ظاہری، ہے طبع آگہ کا نشاں (۳۶ب) غافلاں، عکسِ سوادِ صفحہ ہے گردِ کتاب

منع مت کر حُسن کی، ہم کو پرستش سے کہ ہے (۳۷) یادۂ نظارۂ گلشن، حلالِ عندلیب

ہے مگر موقوف بروقتِ دگر، کار اسدؔ — اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

جاتا ہوں جدھر، سب کی اٹھے ہے ادھر انگشت (۳۸ت) یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے، مگر انگشت

شوخی تری کہہ دیتی ہے احوال ہمارا — رازِ دل صد پارہ کی ہے پردہ در انگشت

اے عدوے مصلحت، چندے بضبط افسردہ رہ (۳۹) کرونی ہے جمع، تابِ شوخیِ دیدارِ دوست

لغزشِ مستانہ و جوشِ تماشا ہے، اسدؔ　　آتشِ مے سے، بہارِ گرمیِ بازار دوست

(۴۰) دو عالم کی مستی پر خطِ وفا کھینچ　　دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت!

نہیں گر بکامِ دلِ خستہ، گردوں　　جگر خواہیِ جوشِ حسرت سلامت!

نہ اوروں کی سنتا، نہ کہتا ہوں اپنی　　سرِ خستہ و شورِ وحشت سلامت!

نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت　　ز خود رفتگی ہائے حیرت سلامت!

رہے غالبِ خستہ مغلوبِ گردوں　　یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت!

ث (۴۱) باز ماندنہای مژگاں ہے یک آغوشِ وداع　　عید، درحیرت سوادِ چشمِ قربانی عبث

جبکہ نقشِ مدعا ہووے نہ جز موجِ شراب　　وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

(۴۲) محملِ پیمانۂ فرصت ہے بردوشِ حباب　　دعویِ دریا کشی و تشنہ پیمائی عبث

یک نگاہِ گرم ہے، جوں شمع سرتاپا گداز　　بہزاد خود رفتگاں، رنجِ خود آرائی عبث

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہوکر سوئے دشت　　بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

اے اسدؔ، بیجا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز　　عالمِ تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث

ج (۴۳) دور افتادۂ چمن فکر ہے اسدؔ　　مرغِ خیال، بلبلِ بے بال و پر ہے آج

(۴۴) شاخِ گل جنبش میں ہے، گہوارہ آسا، ہر نفس　　طفلِ شوخ غنچۂ گل، بسکہ، ہے وحشی مزاج

چ (۴۵) قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ　　رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا، ہیچ

حیرت ہمہ اسرار پہ مجبور خموشی　　مستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ

کس بات پہ مغرور ہے، اے عجزِ تمنا؟　　سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ　　عالم ہمہ افسانۂ ماوارد وما ہیچ

ح (۴۶) ساقِ گلرنگ سے اور آئینۂ زانو سے　　جامہ زیبوں کے، سدا ہیں تہِ داماں گل و صبح

آئینہ خانہ ہے، صحنِ چمنستاں، یکسر　　بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند، اسدؔ　　غفلت آرائیِ یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

د (۴۷) نوازشِ نفس آشنا کہاں؟ ورنہ　　برنگِ نے، ہے نہاں در ہر استخواں فریاد

ہلاکِ بے خبری، نغمۂ وجود و عدم　　جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد

جوابِ سنگ دلی ہائے دشمناں، ہمت　　زدست شیشۂ دل ہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوای اسدؔ　　خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں فریاد!

(۴۸) تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ　　متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

(۴۹) ہاتھ آیا زخمِ تیغِ یار سا پہلو نشیں　　کیوں نہ ہووے آج کے دن بیکسی کی روح شاد؟

ہم نے سو زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی　　گل ہوا ہے ایک زخم سینہ پر خواہانِ داد

تیغ درکف، کف بلب آتا ہے قاتل اس طرف　　مژدہ باد، اے آرزوے مرگِ غالبؔ مژدہ باد

(۵۰) چشمِ داغِ طرب و باغِ کشادِ پر رنگ　　بزبانِ عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند

بزمِ داغِ طرب و باغِ کشادِ پرِ رنگ　　شمع و گل تاکے و پروانہ و بلبل تا چند

نالہ دامِ ہوس و دردِ اسیری معلوم　　شرح بر خود غلطی ہائے تحمل تاچند

اسدؔ خستہ گرفتارِ دو عالم ادہام　　مشکل آساں کنِ یک خلق تغافل تا چند

ر (۵۱) بازگشتِ جادہ پیمای رہِ حیرت کہاں؟　　غافلاں، غش جان کر، چھڑکے ہیں آب آئینے پر

بدگماں کرتی ہے عاشق کو خود آرائی تری　　بے دلوں کو ہے براتِ اضطراب آئینے پر

مدعی میری صفائیِ دل سے ہوتا ہے خجل　　ہے تماشا، زشت رویوں کا عتاب آئینے پر

(۵۲) ہلال آسا تہی رہ، گر کشادن ہائے دل چاہے　　ہُوا مہ، کثرتِ سرمایہ اندوزی سے، تنگ آخر

لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی　　ہوئی قطرہ فشانی ہائے می بارانِ سنگ آخر

اسدؔ، پردے میں بھی آہنگِ شوقِ یار قائم ہے　　نہیں ہے نغمے سے خالی خمیدن ہائے چنگ آخر

(۵۳) اے چرخ، خاک برسرِ تعمیرِ کائنات　　لیکن بنای عہدِ وفا استوار تر

سمجھا ہوا ہوں عشق میں نقصاں کو فائدہ　　جتنا کہ نا امید تر،

(۵۴) اسدؔ کی طرح میری بھی، بغیر از صبحِ رخساراں　　ہوئی شامِ جوانی، اے دلِ حسرت نصیب آخر

(۵۵) ظلم کرنا گدائے عاشق پر — نہیں شاہانِ حُسن کا دستور
دوستو، مجھ ستم رسیدہ سے — دشمنی ہے وصال کا مذکور
زندگانی پہ اعتماد غلط — ہے کہاں قیصؔر اور کہاں فغفور

ز
(۵۶) زبسکہ جلوۂ صیاد حیرت آرا ہے — اڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز
ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے — کہ شیشہ نازک و صہبائی آبگینہ گداز
پا،پُراز آبلہ راہِ طلبِ مے میں ہوا — ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگور ہنوز
گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی — سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

س
(۵۷) کیوں نہ طوطیِ طبیعت نغمہ پیرائی کرے — باندھتا ہے، رنگِ گل، آئینہ تا چاکِ قفس
تیز تر ہوتا ہے خشمِ تندخویاں عجز سے — ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغ شعلۂ خاروخس
اے اسدؔ ہم خود اسیرِ رنگ و بو سے باغ ہیں — ظاہرا،صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس
(۵۸) کفر ہے، غیراز وفورِ شوق، رہبر ڈھونڈھنا — راہ صحرای حرم میں ہے، جرس، ناقوس وبس
یک جہاں گل تختۂ مشقِ شگفتن ہے اسدؔ — غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

ش
(۵۹) دیا داغِ جگر کو آہ نے ساماں شگفتن کا — نہ ہو بالیدہ، غیراز جنبشِ داماں بادِ آتش

ع
(۶۰) چار سو دہر میں بازارِ غفلت گرم ہے — عقل کے نقصاں سے اٹھتا ہے خیالِ انتفاع
آشنا، غالب نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا — ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ استماع

غ
(۶۱) عشاق،اشک چشم سے دھوویں ہزار داغ — دیتا ہے اور، جوں گل وشبنم، بہار داغ
بے لالہ عارضاں مجھے گلگشت باغ میں — دیتی ہے، گرمیِ گل و بلبل،ہزار داغ
ہوتے ہیں محو جلوۂ خور سے ستارگاں — دیکھ اس کے دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ
(۶۲) کون[1] آیا جو چمن بیتاب استقبال ہے — جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیِ رفتارِ باغ

[1] اس کے بعد یہ شعر تھا جسے مولانا نے قلم زد کیا ہے:
آتشِ رنگِ رخ ہر گل کو بخشے ہے فروغ — ہے دمِ سردِ صبا سے، گرمیِ بازارِ باغ

کون گل سے ضعف وخاموشی بلبل کہہ سکے؟ — نے زبانِ غنچہ گویا، نے زبانِ خارِ باغ

ف
(۶۳) ہیں میری مشتِ خاک سے اس کو کدورتیں — پائی جگہ بھی دل میں، تو ہو کر غبار،حیف!
بیش از نفس، بتاں کے کرم نے وفا نہ کی — تھا محملِ نگاہ بدوشِ شرار،حیف
(۶۴) مفتِ دل و جگر، خلشِ غمزہ ہائے ناز — کاوشِ فروشیِ مژۂ تیز یک طرف[1]

ک
(۶۵) آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک — لایا ہے لعلِ بیش بہا، کاروانِ اشک
رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار — مژگاں کو دوں فشار پے امتحانِ اشک
دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار — باغِ بخوں تپیدن و آبِ روانِ اشک
سیل بنای، ہستیِ شبنم ہے، آفتاب — چھوڑے نہ چشم میں تپشِ دل، نشانِ اشک

گ
(۶۶) اے آرزو شہیدِ وفا، خوں بہا نہ مانگ — جز بہر دست و بازوے قاتل دعا نہ مانگ
برہم ہے بزمِ غنچہ، بیک جنبشِ نشاط — کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل، ہوا نہ مانگ
یک بخت اوج، نذرِ سبک باری اسدؔ — سر پر و بالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

ل
(۶۷) نور سے تیرے ہے اس کی روشنی — ورنہ ہے خرشید یک دستِ سوال
(۶۸) امواج کی جو یہ شکنیں آشکار ہیں — ہیں چشمِ اشک ریز سے، دریا شکستہ دل
ناسازیِ نصیب، درشتیِ غم سے ہے — امید نا امید و تمنا شکستہ دل
ہے سنگِ ظلمِ چرخ سے مے خانے میں، اسدؔ — صہبا فتادہ خاطر و مینا شکستہ دل
(۶۹) برقِ سامانِ نظر ہے، جلوۂ بیباکِ حُسن — شمعِ خلوت خانہ کیجے، ہر چہ بادا باد گل

م
(۷۰) تماشائے گلشن تمنائے چیدن — بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں، نہ پروائے داماں — نگہ آشنای گل و خار ہیں ہم
اسدؔ، شکوہ کفر و دعا نا سپاسی — ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم

[1] یہ شعر مولانا نے اضافہ کیا ہے۔

اے بالِ اضطراب، کہاں تک فسردگی؟ (۷۱) یک پر زدن تپش میں ہے، کارِ قفس تمام

کرنے نہ پائے ضعف سے شورِ جنوں اسدؔ   اب کے، بہار کے یونہی گزرا برس تمام

وہ بیدماغِ منتِ اقبال ہوں کہ میں (۷۲) ن وحشت بداغِ سایۂ بالِ ہما کروں

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ (۷۳) جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

گل، غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے (۷۴) اے آگہی، فریبِ تماشا کہاں نہیں؟

برق بجانِ حوصلہ آتش فگن، اسدؔ   اے دل فسردہ، طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں

ناگوارا ہے ہمیں، احسانِ صاحب دولتاں (۷۵) ہے زرِ گل بھی نظر میں جوہرِ فولاد، یاں

قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں اسدؔ   ہے تماشا کردنی گل چینیِ جلاد، یاں

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن (۷۶) قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

بسکہ پائی یار کی رنگیں ادائی سے شکست   ہے کلاہِ نازِ گل برطاقِ دیوارِ چمن

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا (۷۷) واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

بہ زاہداں، رگِ گردن، ہے رشتۂ زنّار (۷۸) سرے بہ پائے بتے نا نہادہ رکھتے ہیں

معافِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز   ولے بدستِ نگارے نداوہ رکھتے ہیں

میں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب (۷۹) لیکن عبث کہ شبنمِ خرشید دیدہ ہوں

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا   یارب، میں کسی غریب کا بخت رسیدہ ہوں؟

میں بے ہنر کہ جوہرِ آئینۂ تھا، عبث   پائے نگاہِ خلق میں خار خلیدہ ہوں

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج   میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

مت رکھ، اے انجام غافل، سازِ ہستی پر غرور (۸۰) چیونٹی کے پر، سرو برگِ خود آرائی نہیں

ہے طلسمِ دہر میں، صد حشر پاداشِ عمل (۸۱) آگہی، غافل! کہ ایک امروز بے فردا نہیں

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر ومنزلت (۸۲) عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

باعثِ ایذا ہے، برہم خوردنِ بزمِ سرور   لختِ لختِ شیشۂ بشکستہ، جز نشتر نہیں

ہے فلک بالانشینِ فیضِ خم گردیدنی   عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں

کب تلک پھیرے اسدؔ لب ہائے تفتہ پر زباں؟   تابِ عرضِ تشنگی، اے ساقیِ کوثر نہیں

ستم کشی کا، کیا دل نے حوصلہ پیدا (۸۳) و اب اُس سے ربط کروں جو بہت ستم گر ہو

سبب، وارستگاں کو ننگِ ہمت ہے، خداوندا (۸۴) اثر سرمے سے اور لب ہائے عاشق سے صدا گم ہو

ہوئی ہے ناتوانی، بے دماغی شوخیِ مطلب   فرو ہوتا ہے سر سجدے میں اے دستِ دعا گم ہو

ہر ذرہ خاک، عرض تمنای رفتگاں (۸۵) آئینہ ہاشکستہ و تمثال ہا گرو

ہم زانوے تامل وہم جلوہ، گاہ گل (۸۶) ہ آئینہ بند خلوت و محفل ہے آئینہ

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ (۸۷) ورنہ ہے چرخ و زمیں، یک ورقِ گردانده

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفت وبیاں   ہے سخن، گروِ زدامانِ ضمیر افشاندہ

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے   ہے ہر اک فرد جہاں میں، ورقِ ناخواندہ

حیف بے حاصلِ اہلِ ریا پر، غالبؔ   یعنی ہیں ماندہ ازآں سوو ازیں سوراندہ

واسطے فکرِ مضامینِ متین کے غالبؔ (۸۸) چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرا میدہ

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ (۸۹) خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ، بلا سمجھ

گاہ بہ خلد امیدوار، گہ بہ جحیم بیم ناک   گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ

نے سرو برگِ آرزو، نے رہ ورسمِ گفتگو   اے دل و جانِ خلق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ

گو تم کو رضاجوئیِ اغیار ہے لیکن (۹۰) ی جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے؟

ہر چند عمر گزری آزردگی میں، لیکن (۹۱) ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی

ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت   دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ (۹۲) لبِ قدح پہ، کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے

پرواز ہا، نیازِ تماشائے حسنِ دوست   بالِ کشادہ ہے، نگہِ آشنا مجھے

تاچند پست فطرتیِ طبعِ آرزو؟   یا رب، ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

خدایا کس قدر اہلِ نظر نے خاک چھانی ہے؟ (۹۴) کہ ہیں صدر رخنہ، جوں غربال، دیواریں گلستاں کی

ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر   بس، اے زخمِ جگر، اب دیکھ لی شورش نمک داں کی

کثرتِ جور و ستم سے، ہو گیا ہوں بے دماغ   خوب رویوں نے بنایا، عاقبت بدخو مجھے

اسدؔ، اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرایش (۹۶) لباسِ نظم میں بالیدن مضمونِ عالی ہے

سیہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے   زمیں، جوشِ طرب سے، جامِ لبریزِ سفالی ہے

نامرادِ جلوہ، ہر عالم میں حسرت گل کرے (۹۷) لالہ، داغِ شعلہ فرسودِ چراغِ کشتہ ہے

ہو جہاں، تیرا دماغِ ناز، مستِ بے خودی   خوابِ نازِ گل رخاں، دودِ چراغِ کشتہ ہے

ہنگامِ تصور ہوں دریوزہ گرِ بوسہ (۹۸) یہ کاسۂ زانو بھی اک جامِ گدائی ہے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ (۹۹) لائق نہیں رہے ہیں، غمِ روزگار کے

اسدؔ، بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ (۱۰۰) اگر وا ہو، تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

اسدؔ، جمعیتِ دل در کنارِ بے خودی خوشتر (۱۰۱) دو عالم آگہی، سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو گل (۱۰۲) حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے

ساقی، بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش   پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے

بستنِ عہدِ محبت ہمہ نادانی تھا (۱۰۳) چشمِ نکشودہ رہا عقدۂ پیماں مجھ سے

آتش افروزیِ یک شعلۂ ایما تجھ سے   چشمک آرائیِ صد شہر چراغاں مجھ سے

اے سرِ شوریدہ، ذوقِ عشق و پاسِ آبرو (۱۰۴) جوشِ سودا کب حریفِ منتِ دستار ہے؟

ترے نوکر ترے در پر اسدؔ کو ذبح کرتے ہیں (۱۰۵) ستم گر، ناخدا ترس، آشنا کش، ماجرا کیا ہے؟

نشاطِ دیدۂ بینا ہے، کو خواب و چہ بیہاری؟ (۱۰۶) بہم آوردہ مژگاں بوسۂ روے تماشا ہے

نگۂ معمارِ حسرت ہا چہ آبادی؟ چہ ویرانی ؟   کہ مژگاں جس طرف وا ہو، کفِ دامانِ صحرا ہے

اسدؔ یاس تمنا سے نہ رکھ امیدِ آزادی   گدازِ آرزوہا، آبیارِ آرزوہا ہے

مژہ فرشِ رہ، و دل ناتواں، و آرزو مضطر (۱۰۷) بہ پائے خفتہ، سیرِ وادیِ پُر خارِ بستر ہے

ہے بہارِ تیز رو گلگونِ نکہت پر سوار (۱۰۸) یک شکستِ رنگ گل، صد جنبشِ مہمیز ہے

تر جبیں رکھتی ہے شرمِ قطرہ سامانی مجھے[1] (۱۰۹) موجِ گردابِ حیا ہے چینِ پیشانی مجھے

عرضِ سرشک پر ہے فضای زمانۂ تنگ (۱۱۰) صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی؟

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدؔ (۱۱۱) دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ سے

یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو (۱۱۲) یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے (۱۱۳) ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے

پر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں   رہے ہم، داغ اپنی کاہلی سے

خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر   پھرے ہم دربدر ناقابلی سے

رشک ہے آسایشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ (۱۱۴) پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

کیا کروں غم ہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار (۱۱۵) وز دگر ہو خانگی، تو پاسباں معذور ہے

رچ گیا جوشِ صفائے زلف کا اعضا میں عکس (۱۱۶) ہے نزاکت جلوہ، اے ظالم، سیہ فامی تری

برگریزی ہائے گل، ہے وضع زرافشاندنی   باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری

بسکہ ہے عبرتِ ادیبِ یادگی ہائے ہوس   میرے کام آئی، دلِ مایوس، ناکامی تری

خانماں جبریانِ غافل از معنی خراب ! (۱۱۷) جب ہوئے ہم بے گنہ، رحمت کی کیا تقصیر ہے؟

آب ہو جاتے ہیں، ننگِ ہمتِ باطل سے مرد   اشک پیدا کر، اسدؔ گر آہ بے تاثیر ہے

نظر بہ غفلتِ اہلِ جہاں ہوا ظاہر[2] (۱۱۸) کہ عیدِ خلق پہ حیراں ہے چشمِ قربانی

غالبؔ، زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک (۱۱۹) آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

محیط دہر میں بالیدن، از ہستی گزشتن ہے (۱۲۰) کہ یاں ہر اک، حباب آسا، شکست آمادہ آتا ہے

دیارِ عشق میں جاتا ہے جو سوداگری ساماں   متاعِ زندگانی ہا بغارت دادہ آتا ہے

اسدؔ، وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں   صنوبر گلستاں میں بادلِ آزادہ آتا ہے

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے (۱۲۱) وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

---

[1] یہ شعر بقلم مولانا اضافہ ہوا ہے۔ [2] یہ شعر بقلم مولانا اضافہ ہوا ہے۔

نفس بہ نالہ رقیب ،ونگہ باشک عدو — زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مے کہ آج (۱۲۲) آرزوے بوسۂ لب ہاے میگوں ہے مجھے

بہ پرفشانیِ پروانۂ چراغِ مزار (۱۲۳) کہ بعد مرگ بھی ہے لذتِ جگر سوزی

تپش تو کیا، نہ ہوئی مشقِ پرفشانی بھی — رہا میں ضعف سے شرمندۂ نوآموزی

آرزوے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا (۱۲۴) کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالب تو پھر — کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

صبح سے معلوم ، آثارِ ظہورِ شام ہے (۱۲۵) غافلاں آغازِ کار، آئینہ انجام ہے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا؟ (۱۲۶) آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

طلسمِ منتِ یک خلق سے رہائی دی (۱۲۷) جہاں جہاں مرے قاتل کا مجھ پہ احساں ہے

جنوں نے مجھ کو بنایا ہے مدعی میرا — ہمیشہ ہاتھ میں میرے مرا گریباں ہے

جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائیں گے (۱۲۸) مرگ سے وحشت نہ کر راہِ عدم پیمودہ ہے

اے اسدؔ، آباد ہے مجھ سے جہانِ شاعری (۱۲۹) خامہ میرا تختِ سلطانِ سخن کا پایہ ہے

رتبۂ تسلیمِ خلت مشرباں ،عالی سمجھ (۱۳۰) چشمِ قربانی ،گلِ شاخ ہلالِ عید ہے

کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از کشمکش — اے خوشا رند ہے کہ مرغِ گلشنِ تجرید ہے

کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے، اسدؔ — یاعلی، وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے (۱۳۱) جوں شمع، دل بہ خلوت جانانہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر — دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

کرتے ہوئے تصورِ یار آئے ہے حیا — کیا فائدہ کہ منّتِ بیگانہ کھینچیے

ہے ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجیے، اسدؔ — رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

گل ، سر بسر اشارۂ جیبِ دریدہ ہے (۱۳۲) نازِ بہار، جز بہ تقاضا نہ کھینچیے

حیرت حجابِ جلوہ و وحشت غبارِ چشم — پا سی نظر بہ دامنِ صحرا نہ کھینچیے

واماندۂ ذوقِ طربِ وصل نہیں ہوں (۱۳۳) اے حسرتِ بسیار، تمنا کی کمی ہے

لالہ و گل بہم ،آئینۂ اخلاق بہار (۱۳۴) ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا مجھے

بے دماغِ تپش و عرضِ دو عالم فریاد — ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اڑایا ہے مجھے

کمالِ حُسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو (۱۳۵) تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

طراوت سحر ایجادیِ اثر یک سو (۱۳۶) بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے

نیاز، پردۂ اظہار خود پرستی ہے — جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے

بہانہ جوئیِ رحمت ،کمیں گرِ تقریب — وفاے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسدؔ، طلسمِ قفس میں رہے، قیامت ہے — خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

حکمِ بیتابی نہیں اور آرمیدن منع ہے (۱۳۷) باوجودِ مشقِ وحشت ہا رمیدن منع ہے

بے خودی ،فرمانروا سے حیرت آبادِ جنوں — زخم دوزی جرم و پیراہن دریدن منع ہے

مانعِ بادہ کشی ناداں ہے ،لیکن اے اسدؔ — بے ولاے ساقیِ کوثر کشیدن منع ہے

چونکہ بالاے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے (۱۳۸) ہوس ہاے جہاں دامن فشانی مفت ہے

یک نفس ہر یک نفس، جاتا ہے قسطِ عمر میں — حیف ہے ان کو جو کہویں ''زندگانی مفت ہے''

شعر[1] کی فکر کو اسدؔ چاہیے ہے دل و دماغ — عذر کہ یہ فسردہ دل، بیدل و بے دماغ ہے

رباعیات[2]

اے کاش ،بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف (۱) پہلوے حیات سے گزر جاتا صاف

اک تسمہ لگا ہے کہ تا روزے چند — رہے نہ مشقتِ گدائی سے معاف

گر جوہرِ امتیاز ہوتا ہم میں (۲) رسوا کرتے نہ آپ کو عالم میں

ہیں نام و نگیں کمیں گہِ نقبِ شعور — یہ چور پڑا ہے خانۂ خاتم میں

(شش ماہی غالب، ادارہ یادگارِ غالب کراچی، شمارہ ۶ تا ۱۰، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۔۲۸)

---

[1] اس کے بعد یہ شعر کاتب نے لکھا تھا جسے مولانا نے کاٹ دیا:

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو — برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

[2] عنوان ''رباعیات'' اور دونوں رباعیاں مولانا نے اپنے قلم سے اضافہ کی ہے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی

غالب اور معارضہ کلکتہ

حادثات اور ہنگامے اوائلِ عمری ہی میں غالب کی زندگی کا معمول بن گئے تھے اور آخر عمر تک کسی نہ کسی صورت میں ان کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے۔ اگرچہ انھوں نے شروع ہی میں خاندانی روایت کے برخلاف پیشۂ سپاہ گری سے ترکِ تعلق کر کے ''تیرِ شکستۂ نیاگاں'' کو قلم بنالیا تھا اور جادۂ سفر کے طور پر شعر و ادب کی راہ منتخب کر لی تھی، لیکن ''عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا'' دلِ وحشی اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً افراسیابی و پشنگی اثرات سے منسوب ہو کر انھیں مبارزطلبی و ستیزہ جوئی پر اکساتا رہتا تھا۔ نتیجے کے طور پر ان کی زندگی میں کئی بار ایسے واقعات پیش آئے جو ان کی عزتِ نفس اور ذہانت و فطانت پر ایک ضربِ کاری ثابت ہوئے اور مدتوں ان کے لیے سوہانِ روح بنے رہے۔ اس سلسلے کا پہلا اہم واقعہ معارضۂ کلکتہ ہے جو ۱۸۲۸ء میں پیش آیا۔

غالب اپنی پنشن کے مقدّمے کی پیروی کے لیے ۲۹/اپریل ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے تھے۔ وجہِ نزاع یہ تھی کہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے اہلِ خانہ کے لیے انگریزوں کی طرف سے جو پنشن مقرر ہوئی تھی اور بعد میں ایک معاہدے کے تحت جس کی ادائیگی کی ذمے داری نواب احمد بخش خاں، والیِ لوہارو، کو منتقل کر دی گئی تھی، غالب کے دعوے کے مطابق نواب صاحب نے ایک طرف تو اس میں تخفیف کر دی تھی اور دوسری طرف خواجہ حاجی کو بھی، جن کا ان کے خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا، غلط طور پر حق دار بنا دیا تھا۔ اسے محض اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے ورودِ کلکتہ سے قبل خواجہ حاجی کے سالے مرزا افضل بیگ اکبر شاہِ ثانی

کے وکیل کی حیثیت سے وہاں پہنچ چکے تھے اور انھوں نے بعض اہم شخصیتوں سے ذاتی تعلقات بھی استوار کر لیے تھے۔ مرزا افضل بیگ کو غالب نے اسی زمانے کی ایک تحریر میں ''یارے از یاران و معاشران و ہم صحبتانِ راقم'' کی حیثیت سے یاد کیا ہے[1] جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کے دوستوں میں سے تھے۔ علاوہ بریں وہ ان کی بڑی بہن چھوٹی بیگم کے شوہر مرزا اکبر بیگ کے حقیقی بھائی بھی تھے۔ اس کے باوجود پنشن کے اس قضیے میں ان کا جھکاو واضح طور پر اپنے بہنوئی خواجہ حاجی کی طرف تھا۔ چناں چہ معاملے کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے غالب کے کلکتہ پہنچتے ہی در پردہ ان کے خلاف ریشہ دوانی شروع کر دی۔ اس سلسلے میں پہلا وار یہ کیا گیا کہ دہلی سے اس تازہ وارد شخص نے اپنا نام اور تخلص دونوں بدل لیے ہیں، گویا اس کی شخصیت مشتبہ ہے۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ غالب اہلِ کلکتہ اور اعیانِ سرکار سے اسد اللہ خاں غالب کی حیثیت سے رُوشناس ہوئے تھے جب کہ سرکاری کاغذات میں ان کا نام صرف ''مرزا نوشہ'' درج تھا اور اس سے قبل وہ اسد تخلص کے ساتھ بحیثیت شاعر معروف و مشخص ہو چکے تھے۔ اتفاق سے اس وقت غالب کے پاس اپنے دیوانِ اردو کے نقشِ ثانی کا سات سال پہلے مرتب کیا ہوا وہ نسخہ موجود تھا جس کی متعدد غزلوں میں اسد تخلص نظم ہوا تھا اور اس کے خاتمے پر وہ مہر بھی ثبت تھی جس پر ''اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ'' اور ''۱۲۳۱ھ'' کندہ تھا۔ ''حداثتِ اسم'' اور تبدیلِ تخلص کے اس الزام کی تردید کا ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوا اور غالب خود کو ''تفرقۂ اسم و علَم'' کی سبکی اور ''دنایتِ تبدیلِ اسم'' کے داغ سے محفوظ رکھنے میں کام یاب ہو گئے۔ اس وار کی ناکامی کے بعد فریقِ مخالف کی طرف سے دوسرا حربہ یہ استعمال کیا گیا کہ انھیں اہلِ تسنّن کے مجمعوں میں غالی رافضی اور شیعوں کی مجلسوں میں صوفی و ملحد و زندیق قرار دے کر بدنام کرنے اور اس طرح اہلِ شہر کو ان کی مخاصمت و مخالفت میں اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی گئی۔ چوں کہ غالب کلکتہ پہنچنے کے فوراً بعد ہی شہر اور نواحِ شہر کے شیعہ معززین سے تعلقات استوار کر چکے تھے اور ان کا خاندانی پس منظر بھی ایسا نہ تھا جس سے لوگ واقف نہ ہوں، اس لیے خلافِ توقع یہ حربہ بھی کام یاب نہ ہو سکا۔

ان دو محاذوں پر ناکامی و پسپائی کے بعد تیسرا محاذ جو غالب کے خلاف کھولا گیا، وہ

خالص ادبی وعلمی نوعیت کا تھا۔اس بار یہ مشہور کیا گیا کہ دہلی سے تازہ وارد یہ شخص، جو بزعم خود فارسی میں شعر گوئی اور زباں دانی کا مدّعی ہے، نہ صرف یہ کہ قتیل کی فارسی دانی کا منکر ہے، ان کے خلاف سخت وسست اور ناشائستہ ونامناسب الفاظ بھی استعمال کرتا ہے۔مزید برآں سخنورانِ کلکتہ کی اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں۔قتیل کی تصانیف اس وقت تک فارسی کے درسی نصابات کا حصّہ بن چکی تھیں اور اس وسیلے سے ملک کے طول وعرض میں ان کا دائرۂ تعارف خاصا وسیع ہو چکا تھا۔علاوہ بریں ان کے شاگرد بھی جابجا موجود تھے۔چنانچہ جب بعض حامیانِ قتیل کو ان کے بارے میں، یا غالب کے اس رویے کا، علم ہوا تو وہ چراغ پا ہوا ٹھے اور اس طرح وہ بساط بچھ گئی جس پر انھیں مات دینا مقصود تھا۔صورت یہ تجویز کی گئی کہ ایک مشاعرے کا اہتمام کر کے دوسرے شعرا کے ساتھ غالب کو بھی دعوتِ سخن دی جائے اور اس کے بعد ان کے کلام پر اعتراضات کر کے انھیں زچ کیا جائے۔اس سلسلے کی پہلی محفلِ سخن یکشنبہ ۸ جون ۱۸۲۸ء کو، یعنی غالب کے ورودِ کلکتہ کے تین ماہ اٹھارہ دن کے بعد منعقد کی گئی۔غالب کے کئی سوانح نگاروں نے ان محافل شعر وسخن کی خاص خاص تفصیلات اپنی تصانیف ومقالات میں بیان کر دی ہیں، اس لیے ان کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، تاہم ان میں سے بعض بیانات کی صحت وثقاہت مشکوک ہے اور بعض مزید تفصیل وتوضیح کے محتاج ہیں۔یہ سطور انھی دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھ کر سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔

سفرِ کلکتہ اور مذکورۂ بالا ادبی معرکے کے ضمن میں پہلا توجّہ طلب بیان جناب مالک رام کا ہے۔''ذکرِ غالب'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> غالب کے ایک فارسی قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس سفر میں دو ہنگامے پیش آئے: پہلا الہ آباد میں، دوسرا کلکتے میں۔الہ آباد والے قضیے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا، ہاں، کلکتے کے معرکے سے متعلق ان کی تحریروں میں کافی تفصیل موجود ہے۔[۲]

یہاں جس قصیدے کا حوالہ دیا گیا ہے، حاشیے کے اندراج کے مطابق وہ کلیات فارسی کا نواں قصیدہ ہے اور حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں ہے۔متذکرہ ہنگاموں کا ذکر اس قصیدے

کے جس شعر میں آیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہے:

نفس بہ لرزہ ز بادِ نہیبِ کلکتہ
نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

اس شعر کے حوالے سے شیخ محمد اکرام کا بھی یہی خیال ہے کہ:

> معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد میں جاتے وقت یا واپسی پر کوئی ناخوش گوار ہنگامہ پیش آیا تھا۔[۳]

جلدی میں ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اپنے ایک مقالے میں، جو غالب انسٹی ٹیوٹ کے دسمبر ۱۹۹۸ء کے سیمینار میں پڑھا گیا تھا، ہنگامۂ الہ آباد کا ذکر غالب کی زندگی کے پہلے ادبی معرکے کی حیثیت سے کیا تھا، لیکن وہ بھی اس کی تفصیلات پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ الہ آباد میں غالب کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ، جسے معرکے کا نام دیا جا سکے، کبھی پیش نہیں آیا۔کلکتے جاتے ہوئے وہ الہ آباد سے گزرے ضرور تھے اور وہاں مختصر قیام بھی کیا تھا۔مولوی محمد علی خاں، صدر امین باندہ، کے نام ایک خط میں اس شہر کے متعلق اپنے تاثرات انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

> آہ از الہ آباد ولعنتِ خدا براں خرابہ باد کہ نہ در وے دوائے درخورِ بیمار، نہ متاعِ شائستۂ مردم۔شرم (وحیا در) مردوزنش ناپیدا ومہر وآزرم از طبع پیر وجوانش گم...... چہ ناانصافی است ایں وادیِ ہول ناک را شہر نامیدن وچہ بے حیائی است آدم زاد دریں دام گاہِ غول آرمیدن...... بخدا کہ اگر بازگشت از کلکتہ منحصر در راہِ الہ آباد باشد، بہ ترکِ وطن گویم وراہِ معاودت نہ پویم۔[۴]

آگے چل کر مدّتِ قیام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> بالجملہ شبا روز دراں دیولاخ بہ جرمِ فقدانِ باربرداری زندانی بودہ روزِ دگر چوں بہلِ کرایہ پیدا شد، سحر گاہاں بر ساحلِ گنگ رسیدہ چوں باد از آب گزشتم وبہ پائے شوق سُوے بنارس پویہ گشتم۔[۵]

ظاہر ہے کہ ایک دن رات کی اس مختصر مدّت میں، جب کہ آگے کے سفر کے انتظام کی فکر بھی باقی تھی، انھیں کسی شخص سے ادبی موضوعات ومسائل پر تبادلۂ خیال اور معرکہ آرائی کا موقع ہی کہاں ملا ہوگا اور واپسی کے سفر میں الہ آباد میں ان کے قیام کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ پیش کردہ شعر کی بنیاد پر مالک رام صاحب اور دوسرے حضرات نے جو رائے قائم کی ہے وہ، بظاہر، اسے سیاق وسباق سے علاحدہ کر کے پڑھنے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ صحیح پس منظر کا اندازہ کرنے کے لیے اس سے پہلے کا یہ شعر بطورِ خاص غور طلب ہے:

کبود پوشم و قرطاس پیرہن دارم
گہے بہ ماتمِ دانش، گہے بہ حسرتِ داد

گویا شاعر کی ''کبود پوشی'' مشعر ہے ''ماتمِ دانش'' پر اور یہ اثر ہے ''بادِ نہیبِ کلکتہ'' کا، جب کہ اس کی ''قرطاس پیرہنی'' مظہر ہے ''حسرتِ داد'' کی، اور اس کا مبدا ومنشا ہے: ''ہنگامۂ الہ آباد۔ مختلف قرائن وشواہد کی روشنی میں مولانا عرشی کا خیال ہے کہ:

اس قصیدے کو ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۶ء) کے قرب وجوار کا ہونا چاہیے۔[۶]

اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ غالب کو مقدمۂ پنشن کے سلسلے میں پے بہ پے کئی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ مولانا کا ارشاد ہے کہ:

میری دانست میں (غالب نے) ''نہیبِ کلکتہ'' اور ''ہنگامۂ الہ آباد'' سے انھی احکام اور فیصلوں اور اس درمیانی مدّت کی کش مکشِ امید وبیم کی طرف اشارہ کیا ہے۔[۷]

یہاں یہ بات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ الہ آباد اس زمانے تک انگریزی حکومت کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا اور گورنر جنرل جب شمالی مغربی ہندوستان کے دورے پر آتے تھے تو وہاں ہفتوں، بلکہ بعض اوقات مہینوں، قیام کر کے علاقائی مسائل اور مقدّمات کے فیصلے کرتے تھے۔[۸] ولیم فریزر کے مقدّمۂ قتل کی تفتیش کے لیے بھی ''حکامِ ستۂ الہ آباد'' سے ایک حاکم بطورِ خاص دہلی آیا تھا۔[۹]

مشاعرے کے محلِ انعقاد اور تاریخ وغیرہ کے سلسلے میں ''ذکرِ غالب'' میں مذکور ہے:

ان دنوں کلکتے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسۂ عالیہ کے زیرِ اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ایک بزمِ سخن ہوا کرتی تھی۔ میرزا کے پہنچنے کے بعد جو مشاعرہ ہوا، اس میں انھوں نے ہمام تبریزی کی زمین میں غزل پڑھی تھی۔[۱۰]

موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق ایک مفصّل مضمون ''غالب کے ادبی معرکے'' میں مالک رام صاحب نے الفاظ کے معمولی سے فرق کے ساتھ یہی بات اس طرح بیان فرمائی ہے:

کلکتے کا مدرسۂ عالیہ علم وادب کا مشہور مرکز تھا۔ یہاں ان دنوں ہر مہینے کے پہلے اتوار کو بزمِ سخن آراستہ ہوتی جس میں شہر کے اہلِ علم جمع ہوتے۔ شاعر حضرات اپنا کلام سناتے اور اصحابِ فہم سے داد وصول کرتے۔ میرزا بھی اسی طرح کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے اور انھوں نے اپنی غزل پیش کی۔[۱۱]

واقعہ یہ ہے کہ غالب کے ورودِ کلکتہ سے قبل وہاں اس قسم کی کوئی محفلِ سخن منعقد نہ ہوتی تھی جس کا ذکر ان تحریروں میں، یا اس سلسلے کی دوسری نگارشات میں، کیا گیا ہے۔ اس مشاعرے کی بنیاد ان کے پہنچنے کے بعد بطورِ خاص انھیں اس میں شریک کرنے اور اس طرح ان کے کلام کو موردِ اعتراض بنانے کے لیے ڈالی گئی تھی اور ان دونوں صورتوں میں جو فرق ہے، اہلِ نظر اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ غالب نے مولوی محمد علی خاں کے نام ایک خط میں بھی واضح اور واشگاف الفاظ میں لکھا ہے کہ:

سخنوران ونکتہ رسانِ اس بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزمِ سخنے آراستہ بودند در ہر ماہِ شمسی انگریزی، روزِ یکشنبۂ نخستیں۔[۱۲]

مکتوب الیہ موصوف ہی کے نام ایک اور خط میں اس محفلِ مشاعرہ کے اہتمام اور اس کی غرض وغایت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یکے از اقربائے مولوی عبدالکریم خاصۂ از بہرِ تذلیل وتخریبِ من انجمنے بنا نہادہ ومشاعرہ قرار دادہ رقعہ ہا بہ شعرائے کلکتہ نوشت ومرا نیز دعوت کرد۔ ریختہ گویاں رامصرعِ ریختہ وپارسی گویاں رامصرعِ پارسی فرستادہ فقیر را ہر دو مصرع داد۔ چناں کہ

یکشنبۂ گزشتہ، ہشتمِ ماہ جون روزِ مشاعرہ بود۔ من ہم رفتم وغزل ہائے طرحی ہر دو
زبان خواندم۔ بہ عنایت ایزدی خاص وعام متلذّذ گشتند...... خدائے را نازم کہ
ہنگامۂ را کہ برائے رسوائی و بے آبروئی من موضوع بودہ، باعثِ شہرت واظہار کمالِ
من گردانید۔[۱۳]

اس مشاعرے کے سلسلے میں مختلف اربابِ علم نے اب تک جو معلومات فراہم کی ہے، اس کے تتمے، یا تکملے، کے طور پر یہ عرض کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اس کے اصل بانی مولوی سراج الدین احمد تھے جن سے بعد میں غالب کے تعلقات اس حد تک دوستانہ ہو گئے تھے کہ ایک موقع پر انھوں نے نہایت فخر کے ساتھ انھیں اپنا ''مخلصِ صادق الولا'' کہا ہے۔ پیش کردہ اقتباس میں ''یکے از اقربائے مولوی عبدالکریم'' سے بھی مولوی سراج الدین احمد مراد ہیں، اس کا ثبوت اسی سلسلے کے ایک دوسرے خط میں غالب کے اس بیان سے مل جاتا ہے:

مولوی سراج الدین احمد برادر زادۂ مولوی عبدالکریم اندو در شمارِ اعیان واشخاصِ دفتر
خانۂ فارسی شامل۔[۱۴]

خود مولوی سراج الدین احمد کے نام کے ایک خط میں ان کے اس معاندانہ اقدام پر حیرت وافسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

من وایمانِ من کہ از درازنفسیِ سفہا شکوہ سنج نیم امّا از نا انصافیِ فقہا چوں گویم کہ
شکایت ندارم۔ نخست بہ زباں ہا افتاد کہ فلانے قتیل را ناسزا می گوید، عالمے برمن
شوریدو انجمن بامن معارض گردید۔ یکے را بروے من آوردند ومراصید زبونِ وادیِ
سخن شمردند چوں دیدند کہ طرفے نہ بستیم ورونقِ بازارِ خویش بہ گزاف شکستیم، فراہم
شدند وفیل ورخ راطرح دادہ بساطِ شطرنج پرخاش راوقفِ رفتار پیادہ ساختند......[۱۵]

مخالفین کی سرگرمیاں مولوی صاحب ہی کی سرپرستی وپشت پناہی کا نتیجہ تھیں، اس کی طرف نہایت لطیف پیرائے میں اشارہ کرتے ہوئے اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

چوں پروازِ صعوہا بہ بالِ عقاب است وروانیِ جو یہا بہ پشت گرمیِ محیط، دلم ازیں

وادی برآشفت وخاطرم خیلِ غم گین گردید۔[۱۶]

مشاعرے کے محلِ انعقاد کے بارے میں اس موضوع پر لکھنے والوں کے درمیان جزوی نوعیت کے بعض اختلافات موجود ہیں، مثلاً پروفیسر حمید احمد خاں نے اگست ۱۹۳۸ء میں قیامِ کلکتہ کے دوران مولانا ابوالکلام سے اپنی ایک ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کا یہ بیان نقل کیا ہے:

مدرسہ اپنی موجودہ عمارت میں سنہ ۱۸۶۰ء یا سنہ ۷۰ء کے قریب منتقل ہوا۔ غالب کو
مثنویِ ''بادِ مخالف'' والا ہنگامہ مدرسے کی پہلی عمارت میں پیش آیا تھا جو سیالدہ میں
بیٹھک خانہ روڈ پر تھی۔[۱۷]

وفا راشدی نے بھی اپنے ایک مضمون ''غالب اور بنگال'' میں یہی لکھا ہے کہ: مرزا قتیل کی زباں دانی کا مباحثہ بنگال کی سب سے مشہور علمی درس گاہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی پرانی عمارت واقع بیٹھک خانہ روڈ سیالدہ میں ہوا تھا۔[۱۸]

اس کے برخلاف مالک رام نے اس سلسلے میں حسبِ ذیل معلومات فراہم کی ہے:

۱۹۳۹ء میں کلکتے کے متعدد بزرگوں نے میرے پوچھنے پر مجھے بتایا تھا کہ یہ مشاعرہ
مدرسۂ عالیہ کی موجودہ ولزلی اسٹریٹ والی عمارت میں ہوا تھا۔ اس سے پہلے مدرسہ
بیٹھک خانے میں تھا۔ اس ولزلی اسٹریٹ والی عمارت کا سنگِ بنیاد ۱۵؍ جولائی
۱۸۲۴ء کو رکھا گیا تھا۔ پوری عمارت تین سال کی مدت میں تیار ہوئی اور غالب کے
کلکتہ پہنچنے سے صرف چند ماہ پہلے اگست ۱۸۲۷ء میں جماعتیں اس جگہ منتقل ہوئی
تھیں۔[۱۹]

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ۳۹۔۱۹۳۸ء میں ایسا کوئی بھی شخص موجود نہ ہوگا جو ایک سو دس سال پہلے کے اُن واقعات کا عینی شاہد ہو، اور سینہ بہ سینہ روایات اکثر علم وتحقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتیں، چنانچہ پروفیسر حمید احمد خاں کی دریافت وتحقیق کے نتیجے میں جو معلومات سامنے آئی ہیں، ان کی رُو سے پہلے دونوں بیانات یک سر نادرست ہیں۔ تیسرا بیان

واقعاتی اعتبار سے درست ہے، لیکن اس کی خامی یہ ہے کہ شواہد سے مستحکم نہیں۔ حمید احمد خاں صاحب نے یہی تمام باتیں ایک مستند حوالے کے ساتھ تحریر فرمائی ہیں، اس لیے ان کا بیان باوثوق اور قابلِ ترجیح ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب بعض اسباب کی بنا پر مجھے مولانا آزاد کی منقولۂ صدر روایت پر شبہ پیدا ہوا تو مدرسے میں، میں نے شمس العلما مولوی محمد موسیٰ صاحب سے، جو اس وقت مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے، اس مسئلے کے تصفیے میں مدد کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں موصوف نے ''بنگال۔ ماضی اور حال'' (Bengal - Past & Present) کی جلد ہشتم نمبر ۱۵ کے صفحات ۸۳ تا ۱۱۱ کے حوالے سے یہ معلومات فراہم کی کہ ولزلی اسکوائر میں مدرسے کی جدید عمارت کی تعمیر کا فیصلہ گورنمنٹ نے جون ۱۸۲۳ء میں کیا، ۱۵ جولائی ۱۸۲۴ء کو اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور مدرسہ اگست ۱۸۲۷ء میں یہاں منتقل ہو گیا۔[۲۰] چونکہ اسی طرح یہ بات مصدقہ طور پر طے ہو گئی کہ مدرسۂ عالیہ غالب کے ورودِ کلکتہ سے قبل ہی موجودہ عمارت میں منتقل ہو چکا تھا، اس لیے اب پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مشاعرے یہیں منعقد ہوئے تھے۔

ان مشاعروں میں غالب کی پڑھی ہوئی غزلوں پر جن بزرگوں نے اعتراضات کیے تھے انھوں نے ان کے نام ظاہر کرنے سے، غالباً دانستہ طور پر، احتراز کیا ہے تاکہ یہ امر ان کی شہرت کا باعث نہ ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک خط میں صرف یہ لکھا ہے کہ:

گروہا گروہِ مردم در من افتادند و نکتہ چینی و آہوگری آغاز کردند۔[۲۱]

اس کے برخلاف ان کے بعض سوانح نگاروں نے سمعی روایات کی بنا پر چند اشخاص کے تعین کی کوشش کی ہے، مثلاً نواب علاء الدین خاں علائی کا بیان ہے:

اس مخالفت کا باعث مولوی عبدالقادر صاحب نام اور مفتی کبیر احمد صاحب نام دو بزرگِ کلکتہ تھے اور یہ دونوں آدمی کالج گورنمنٹ میں معلم اور مشاہیر سے تھے۔[۲۲]

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

غالب کے معترضین میں مولوی عبدالقادر رام پوری، مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور فارسی کے دوسرے مستند استاد (شامل) تھے۔[۲۳]

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ''غالب'' پر اپنی تعلیقات میں تحریر فرماتے ہیں:

کلکتے میں جن لوگوں نے یہ ہنگامہ برپا کیا تھا، میں ان کے نام معلوم کرنا چاہتا تھا مگر بجز دو تین کے معلوم نہ ہو سکے۔ ایک صاحب احمد علی گوپا مئو کے، پرنس غلام محمد (میسور) کے یہاں میر منشی تھے...... دوسرے صاحب انھی کے ہم نام مولوی احمد علی مدرسۂ عالیہ میں مدرس...... تھے۔ تیسرے ایک صاحب مولوی وجاہت علی لکھنوی، گورنر جنرل کے دفتر انشا میں ملازم تھے...... وجاہت علی قتیل کے شاگرد تھے اور وجاہت تخلص کرتے تھے۔[۲۴]

پروفیسر حمید احمد خاں کا ارشاد ہے:

مدرسۂ کلکتہ کے قضیے (کا)...... تو ''یادگارِ غالب'' میں مولانا حالی نے، اور خود غالب نے اپنے مکاتیب میں، تفصیل سے ذکر کیا ہے البتہ ایک چیز، جس کا ذکر مولانا حالی نے اور خود مرزا غالب نے بھی نہیں کیا، یہ ہے کہ معترضین میں سب سے زیادہ بلند بانگ ایک صاحب نواب زادہ مرزا امان علی خاں تھے۔ یہ بھی غالب تخلص کرتے تھے، عظیم آباد کے رہنے والے تھے اور کچھ عرصے پہلے کلکتے میں آ رہے تھے۔[۲۵]

وفا راشدی نے معترضین کی اس فہرست میں مرزا امان علی خاں کے ساتھ خود مرزا قتیل کو بھی شامل کر لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

کلکتہ میں مرزا کے...... ناقدین...... میں دو نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا نام مرزا امان علی خاں طالب عظیم آبادی کا ہے۔ یہ غالب کے سب سے بڑے حریف تھے۔ انھوں نے غالب کے جواب میں اپنا تخلص بھی غالب رکھ لیا تھا، اور کلامِ غالب کے پرزے اڑانے پر تل گئے تھے۔ ان کا تذکرہ حالی کی ''یادگارِ غالب'' میں ملتا ہے، نہ غالب کے خطوط میں۔ غالب کے دوسرے حریف کا نام مرزا قتیل ہے۔[۲۶]

علائی غالب سے قرابتِ قریبہ رکھنے والوں میں شامل ہیں، اس لیے ان کے بیان کو بہ آسانی رد نہیں کیا جاسکتا، تاہم انھوں نے جن دو حضرات کے نام لیے ہیں، ان میں سے آخر الذکر کے بارے میں مالک رام صاحب کا خیال ہے کہ ان سے غالباً حافظ اکبر کبیر مراد ہیں جو رام پور کے رہنے والے تھے اور اُس زمانے میں مدرسۂ عالیہ میں مدرس تھے۔[۲۷] دوسرے صاحب، یعنی مولوی عبدالقادر، اگر شیخ محمد اکرام کے بیان کردہ مولوی عبدالقادر رام پوری سے مختلف نہیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا اس زمانے میں کلکتے میں موجود ہونا مشکوک ہے۔ مولوی عبدالقادر رام پوری اور باقی دو صاحبان، جن کے نام شیخ محمد اکرام نے معترضین کی فہرست میں شامل فرمائے ہیں، دراصل غالب کے دوستوں اور قدر شناسوں میں سے تھے۔ اس سلسلے میں غالب کی تحریر سے شیخ صاحب کو جو غلط فہمی ہوئی ہے، مالک رام صاحب نے ''ذکرِ غالب'' میں نہایت مناسب طور پر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مولانا ابوالکلام کے دریافت کردہ مخالفین میں سے بھی کم سے کم ایک، یعنی مولوی احمد علی مدرسِ مدرسۂ عالیہ، اس اعتبار سے خارج از بحث ہو جاتے ہیں کہ ان کی ولادت محقق طور پر غالب کے ورودِ کلکتہ کے تقریباً بارہ برس بعد، ۱۷ر دسمبر ۱۸۳۹ء، کا واقعہ ہے۔[۲۸] احمد علی گوپامئوی اور وجاہت علی لکھنوی کا معاملہ بھی ان سے مختلف نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ مولانا آزاد کے ذریعۂ معلومات کی کم زوری ثابت ہے اور کسی دوسرے معاصر ذریعے سے اس روایت کی تائید نہیں ہوتی۔

پروفیسر حمید احمد خاں اور وفا راشدی نے نواب زادہ امان علی خاں غالب عظیم آبادی کو اس معرکے میں سب سے زیادہ بلند بانگ قرار دیا ہے۔ وفا راشدی کے بقول، انھوں نے غالب تخلص بھی مرزا غالب کے جواب میں اختیار کیا تھا۔ یہ دعوے بھی سینہ بہ سینہ روایات پر مبنی ہیں۔ مرزا امان علی خاں کا ذکر نساخ کے یہاں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> غالب: مرزا امان علی خاں عظیم آبادی، مؤلفِ اردو ''قصۂ امیر حمزہ''، شاگردِ قتیل، مدت تک ڈپٹی کلکٹر تھے۔ بہت دنوں سے کلکتے میں سکونت اختیار کی ہے۔ شعرِ فارسی بھی کہتے ہیں۔ پہلے قومِ ہنود سے تھے۔ پھر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان سے

> چندر نگر عرف فرانسیڈانگا میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا ''قصۂ امیر حمزہ'' نظر سے گزرا۔[۲۹]

غالب مذکور کا نومسلم اور شاگردِ قتیل ہونا بہت اہم ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں اور راشدی صاحب کی اس سے ناواقفیت ان کے ذریعۂ معلومات کی کم زوری پر دلالت کرتی ہے۔ نساخ ان سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ اگر مرزا غالب کے خلاف اس ہنگامے میں ان کا شریک ہونا، یا غالب کے مقابلے میں غالب تخلص اختیار کرنا، اس زمانے میں عام طور پر لوگوں کے علم میں ہوتا تو نساخ اس کا ضرور ذکر کرتے۔ وفا راشدی نے قتیل، متوفا ۳۱ جنوری ۱۸۱۸ء، کو بھی ان کی وفات کے تقریباً ساڑھے دس سال بعد کے اس ہنگامے میں شریک کرلیا ہے۔ ان کی معلومات اور تحقیق کی سطحیت اس سے بھی بخوبی ظاہر ہے۔

بنگال کے عصرِ حاضر کے معروف مصنفین میں سے راشدی صاحب کے علاوہ سید لطیف الرحمان اور ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بھی اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ لطیف الرحمان صاحب نے ''محفلِ مشاعرہ ہی میں...... بڑھ چڑھ کر اعتراض کرنے والوں میں'' مولوی وجاہت علی لکھنوی ملازمِ دفترِ گورنر جنرل، احمد علی گوپامئوی، مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی کے نام لیے ہیں۔[۳۰] بھٹاچاریہ نے ان حضرات میں سے مولوی کرم حسین اور نعمت علی عظیم آبادی کے علاوہ باقی تینوں اشخاص کا مخالفینِ غالب میں شامل ہونا بیان فرمایا ہے۔[۳۱] ان دونوں حضرات کے یہ ارشادات سابق الذکر مصنفین کے بیانات کی صدائے بازگشت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ بھٹاچاریہ صاحب نے احمد علی گوپامئوی کے بارے میں یہ لکھ کر کہ وہ بھوپال کے رہنے والے تھے، اور مولوی عبدالقادر رام پوری کے متعلق یہ فرما کر کہ وہ نواب عماد الملک بلگرامی کے دادا تھے، اپنی تحقیق کی سطحیت خود ہی ظاہر فرمادی ہے۔ عماد الملک کے دادا دراصل مولوی کرم حسین بلگرامی تھے۔ جنھیں شیخ محمد اکرام نے مولوی عبدالقادر رام پوری کے ساتھ مخالفینِ غالب میں شمار کیا ہے۔[۳۲]

غالب کی مخالفت اور ان کے خلاف اس ہنگامے کی منصوبہ بندی اور سربراہی کے سلسلے

میں حرفِ آخر کے طور پر ایک بار پھر مرزا افضل بیگ کا ذکر ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام نے اس ضمن میں جن تین لوگوں (احمد علی گوپامئوی، احمد علی مدرسِ مدرسۂ عالیہ اور مولوی وجاہت علی وجاہت لکھنوی) کے نام لیے ہیں، ان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ان لوگوں نے صرف اعتراضات ہی نہیں کیے تھے بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات ''جامِ جہاں نُما'' نے، جو فارسی کا ہفتے وار اخبار تھا، چھاپ دی تھیں۔[33]

مالک رام صاحب نے کسی کا نام لیے بغیر مجملاً صرف یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

> مخالفوں نے ان کے کلام پر اعتراض لکھ لیے (تھے) اور غالباً انھیں شائع (بھی) کر دیا تھا۔[34]

مولانا آزاد کا بیان ان کے پچھلے بیان ہی کا حصّہ ہے اور اس کی کم زوری واضح ہو چکی ہے، اس لیے یہاں اس سلسلے میں مزید کچھ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مالک رام صاحب کا ارشاد ''مآثرِ غالب'' کے ایک خط پر مبنی ہے جس کے مکتوب الیہ، قاضی عبدالودود کے قیاس کے مطابق، مرزا احمد بیگ طپاں ہیں۔ راقم السطور نے بھی اس مجموعے کی تازہ اشاعت میں اس خط کو بدستور طپاں کے نام کے خطوط میں شامل رکھا ہے، لیکن اب مزید غور وفکر کے بعد اندازہ یہ ہوا کہ اس کے مخاطب مرزا احمد بیگ نہیں، مرزا افضل بیگ ہیں۔ خط کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

> جنابِ مرزا صاحبِ والامناقب، ستودہ شیم، مجمعِ لطف وکرم زاد عنایتہ، پس از اعلان التزامِ شیوۂ تسلیم معروض ایں کہ مجموعۂ نثرے کہ فرستادہ بودند، از نظر گزشت وتادیدہ سوادآں بیاض آشنا گشت، حیرتے چند روے داد کہ توضیحِ آں ضرور افتاد لیکن از آں جا کہ دماغِ ہنگامہ وعزمِ تحریرِ داوری نامہ نداریم، شرط کردہ ایم کہ دریں صفحہ بہ آرائشِ عبارت نہ گرائیم ومتصدیِ جوابِ اعتراضات نہ شویم تا ہر کہ بیند، بداند کہ ما را التفات بہ جواب وروے درمقابلہ نیست۔[35]

آخر میں ایک بار پھر بھی یہ صفائی پیش کی گئی ہے کہ:

> مطلب از تحریرِ ایں عریضہ عرضِ شکایت نیست، چناں کہ خود در صدرِ نامہ شرح دادہ ایم۔ خامہ فرسائی در ہوائے آنست کہ فرارسیدگاں وارسند و دریابندگاں دریابند۔ اللہ

> بس، ما سوا ہوس۔[36]

طرزِ تخاطب کی رسمی نوعیت کے علاوہ مندرجات کی کیفیت سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس خط میں غالب براہِ راست اپنے معترض یا حریف سے ہم کلام ہیں، کسی اور سے نہیں۔ اس پس منظر میں ''مرزا صاحبِ والا مناقب'' سے نہ تو مرزا احمد بیگ طپاں مراد ہو سکتے ہیں، اور نہ مرزا ابوالقاسم خاں جو اس معاملے میں ان کے حامی اور حریف تھے۔ مرزا اکبر بیگ بھی اس لحاظ سے خارج از بحث قرار پاتے ہیں کہ وہ کلکتے میں موجودگی کے باوجود اس ہنگامے سے غالباً بالکل لاتعلق رہے۔ چوں کہ وہ غالب کے بڑے بہنوئی ہونے کی بنا پر ان کے بزرگوں میں شامل تھے، اس لیے اگر ان سے غالب کو کوئی تکلیف پہنچی ہوتی تو وہ کسی نہ کسی طرح اس کا تذکرہ ضرور کر دیتے۔ چوتھے اور آخری شخص یہی مرزا افضل بیگ تھے جن کی معاندت ومخالفت کسی ثبوت کی محتاج نہیں، اس لیے ہمارے نزدیک اس خط میں وہی غالب کے مخاطب ہیں اور اس طرح یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اعتراضات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا یہ کام انھی نے انجام دیا تھا۔ جہاں تک ان اعتراضات کی اشاعت کا تعلق ہے، اسے ایک قیاس سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی کیوں کہ کسی معاصر ذریعے سے اس کا تائید نہیں ہوتی۔

گفت گو کے اس سلسلے میں ایک اور امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کلامِ غالب پر مبیّنہ اعتراضات برسرِ مشاعرہ کیے گئے تھے، چنانچہ مالک رام اپنے مضمون ''غالب کے ادبی معرکے'' میں لکھتے ہیں:

> میرزا......مشاعرے میں شریک ہوئے اور انھوں نے اپنی غزل پیش کی۔
>
> تا کیم دودِ شکایت زِبیاں برخیزد
> بزن آتش کہ شنیدن زِمیاں برخیزد
>
> اسی غزل میں ایک شعر ہے:
>
> جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
> ہم چو موئے کہ بتاں رازِ میاں برخیزد

اس پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ مصرعِ اُولا میں ''ہمہ عالم'' کی ترکیب غلط ہے...... ایک اور صاحب نے کہا کہ ''بیشم'' کی جگہ تفضیل، یعنی ''بیشترم''، چاہیے تھا۔ کسی اور نے کہا کہ ''موے میاں'' کی ترکیب غلط ہے۔[37]

الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی بات ''ذکرِ غالب'' میں بھی کہی گئی ہے۔[38]

اول الذکر مضمون میں فاضلِ موصوف نے ایک اور جگہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ جب مشاعرہ گاہ میں لوگوں نے بہ سندِ قتیل ان پر اعتراض کیا تو انھوں نے ڈانٹ کر کہا کہ قتیل، کون قتیل؟ وہ فرید آباد کا کھتری بچہ![39] شیخ محمد اکرام اور بعض دوسرے حضرات کی تحریریں بھی واقعات کی اسی نہج کی طرف اشارہ کرتی ہیں لیکن امورِ واقعہ کی یہ ترتیب و تفصیل محض خیال آرائی کا نتیجہ ہے، حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے، اس سلسلے کا پہلا مشاعرہ ۸/ جون ۱۸۲۸ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں خاص و عام سبھی غالب کے کلام سے محظوظ و متاثر ہوئے اور مخالفین کی خواہش و کوشش کے باوجود ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جسے ناخوش گوار کہا جا سکے۔ چنانچہ غالب اپنی اس سرخ روئی پر اظہارِ شکر کرتے ہوئے مولوی محمد علی خاں کو لکھتے ہیں:

خدائے را نازم کہ ہنگامۂ را کہ برائے رسوائی و بے آبروئیِ من موضوع بود، باعثِ شہرت و اظہارِ کمالِ من گردانید۔[40]

''موے زمیاں بر خیزد'' والی غزل دوسرے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی جو ۲ جولائی ۱۸۲۸ء کو ہوا ہوگا۔ یہ مشاعرہ بھی حسبِ سابق بخیریت گزر گیا۔ اعتراضات کی کارروائی مشاعرہ گاہ کے باہر اور غالباً کئی دن کے بعد شروع ہوئی، چنانچہ خود غالب کا بیان ہے:

پس از ہفتۂ خبر رسید کہ بے دانشے بیتے از ابیاتِ مرا خردہ گرفتہ و خود را در نظرِ اہلِ معنی رسوا ساختہ است۔[41]

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ اعتراضات کو ہوا دینے والا صرف ایک شخص تھا اور بظاہر حال یہ شخص واحد مرزا افضل بیگ ہی ہو سکتے ہیں جن کے نام اس نوعیت کے ایک خط کی نشاں دہی گذشتہ سطور میں کی جا چکی ہے۔ غالب کا ارادہ تھا کہ وہ ''صحبتِ سوم'' میں، یعنی ۱۳/ اگست

۱۸۲۸ء کو، ان اعتراضات کے جواب دیں گے۔ اتفاق سے انھی ایام میں ''اعیانِ عجم'' میں سے ایک ''گراں مایہ شخص''، بعہدۂ سفارت کلکتے میں وارد ہوا اور اس نے بھی منتظمینِ مشاعرہ کی دعوت پر اس انجمن میں شرکت کی۔ سفیرِ مذکور نے، بقولِ غالب، ان کا کلام سن کر ان کی شعر گوئی اور پارسی دانی کی دل کھول کر تعریف کی۔ اس کے معاً بعد غالب نے ان اعتراضات کے جواب دینا شروع کیے جو ان کے منقولۂ بالا شعر پر وارد کیے گئے تھے۔ ایرانی سفیر نے بھی اس قضیے میں ان کی ہم نوائی کی اور وقتی طور پر یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔[42]

تیسرے مشاعرے کی اس ناکامی و پس پائی نے معاندینِ غالب کی آتشِ غیظ و غضب کو مزید تیز کر دیا۔ غالباً اس کے بعد ہی اعتراضات کو باقاعدہ تحریر میں لانے کی حکمتِ عملی وضع کی گئی تا کہ ہم خیال اہلِ علم سے تائیدی بیانات حاصل کر کے اور انھیں شہرت دے کر نامرادی و رسوائی کے اس داغ کو دھویا جا سکے، چنانچہ شاعر و غیر شاعر کی تخصیص سے بالاتر ہو کر اس گروہ کا ہر شخص اپنی جماعت کی سرخ روئی اور غالب کی شکست کی خاطر اس منصوبہ بند مہم کی کامیابی کے لیے سرگرم ہو گیا۔[43] اعتراضات کے اس سلسلے میں ''زدہ'' ردیف والے جس دوسرے شعر کا حوالہ عام طور پر دیا جاتا ہے، مالک رام صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

معلوم نہیں یہ غزل انھوں (غالب) نے اسی مشاعرے میں پڑھی تھی (جس میں ''برخیزد'' ردیف والی غزل پڑھی گئی تھی) یا کسی دوسرے مشاعرے میں۔

ہمارے اندازے کے مطابق اس کا تعلق ۱۳/ اگست ۱۸۲۸ء کے بعد کی اسی مہم سے ہے۔ مرزا افضل بیگ کے نام کے محولۂ بالا خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم کو متوقع انجام تک پہنچانے کے لیے غالب کے کلام میں حسبِ ضرورت ترمیم و تحریف کا حربہ بھی پوری ہوشیاری کے ساتھ استعمال کیا گیا اور غالباً دفتری نوعیت کی ان کی بعض تحریروں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ اسی پس منظر میں غالب اس ''مجموعۂ نثر'' کا، جو ''مرزا صاحب'' نے انھیں بھیجا تھا اور غالباً اس سلسلے کے تمام اعتراضات پر مشتمل تھا، حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

دراں اوراق مرقوم دیدہ ایم کہ ایں مصرع: نگاہش از درازی ہائے مژگاں بر نمی آید،

وہم چنیں ایں شعر: کردم آن نالہ کہ تا شب اثرے باز نداد، بے معنی است......

ہیہات! از درازیِ مژگاں'' چہ معنی دارد؟ ''کردم آں نالہ'' یعنی چہ؟ بندِ کاغذے، کہ
درمشاعرہ بدستخطِ بندہ گزشتہ ہست، نیک بنگرند کہ مطلع ایں است:

نہ از ناز است کز چشمِ وے آساں بر نمی آید
نگاہش با درازی ہاے مژگاں بر نمی آید

امّا شعر ایں است:

آہ ازاں نالہ کہ تا شب اثرے باز نداد
بہ ہم آہنگیِ مرغانِ سحر خواں زدہ

مدّعا ایں کہ شعر را غلط دانند امّا غلط نخوانند۔[45]

اس خط سے جہاں یہ پتا چلتا ہے کہ یہ غزلیں بھی اسی سلسلے کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منتظمین مشاعرہ شریکِ محفل شعرا کے کلام کو باضابطہ طور پر محفوظ بھی رکھتے تھے۔ غالب کو شکایت اس بات کی تھی کہ معترضین نے ان کے اپنے خط میں محفوظ غزلوں کو سامنے رکھنے کی بجاے، یا تو بالقصد یا بر بناے سہو، بعض اشعار کو محرف صورت میں پیش کر کے غلط طور پر ہدفِ تنقید بنایا تھا۔

ایک اور اعتراض، جس کا علم اس خط سے ہوتا ہے، املا کے معاملے میں غالب کے بعض مختارات و معمولات سے متعلق تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، غالب فارسی میں ذالِ معجمہ کے وجود کے قائل نہ تھے چنانچہ وہ ''گذشتن''، ''پذیرفتن'' اور اس قبیل کے دوسرے متعدد الفاظ کو ہمیشہ زاے ہوّز سے لکھتے تھے۔ معترضین کے نزدیک ان کا یہ اجتہاد یا تصرّف ناجائز تھا، چنانچہ وہ اسے غلطیِ املا سے تعبیر کرتے تھے۔ غالب اس سلسلے میں اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دیگر دراں صحیفہ مندرج بودہ است کہ:
گذاشتن و گذشتن و پذیرفتن بہ زاے ہوز نوشتن غلطیِ املا است۔
نکتہ شناساں غلطیِ املا وقتے می تواں گفت کہ (نویسندہ) دانا نباشد و سہو در تحریر افتد،

حال آں کہ تحقیقِ ما براے ما کافی و در نفسِ خویش تمام است۔ اگر پذیرند، از شادی نہ بالیم۔ اگر خردہ گیرند از اندوہ نہ نالیم۔[46]

سطورِ بالا میں جن غزلوں کے دو شعر زیرِ بحث آئے ہیں، وہ از روے قیاس ۷/ستمبر ۱۸۲۸ء اور ۱۵/اکتوبر ۱۸۲۸ء کے مشاعروں میں پڑھی گئی ہوں گی اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ اعتراضات اکتوبر ۱۸۲۸ء میں، یا اس کے بعد، تحریری صورت میں قلم بند کیے گئے ہوں گے۔

غالب کی زباں دانی پر معترضین کے یہ حملے اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے زیادہ سنگین اور زوردار نہیں تھے اور ان کا دفاع بھی انھوں نے بظاہر پوری خود اعتمادی کے ساتھ کیا تھا تاہم مولانا حالی کے بقول:

(وہ) اعتراض اور مخالفت سے بہت جزبز ہوتے تھے (اور) ان کے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔[47]

چنانچہ ان کی بعض تحریریں شاہد ہیں کہ تمام تر ظاہری رکھ رکھاو کے باوجود باطنی طور پر وہ خود کو اس خوف و ہراس کے اثر سے محفوظ نہیں رکھ سکے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ انھی ایام میں ایک بار انھوں نے مرزا ابوالقاسم خاں کے بھیجے ہوئے اچار کا اور دال کے تحفے اور ان کے ایک قطعے کی رسید میں چند شعر بطورِ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر بھیج دیے تھے۔ بعد میں انھیں خیال آیا کہ ممکن ہے ان اشعار میں کوئی سقم رہ گیا ہو اور مبادا یہ کاغذ مخالفین کے ہاتھ لگ جائے اور وہ ان کے لیے کوئی نئی پریشانی کھڑی کردیں، اس لیے انھوں نے غور و فکر کے بعد اسی زمین میں ایک اور قطعہ کہا اور اسی روز شام کو ایک خط کے ساتھ مرزا صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اس خط کے یہ مندرجات اس زمانے کی ان کی ذہنی کیفیت کی مکمل عکاسی کرتے ہیں:

بامداداں کہ قطعۂ در جوابِ والا نامہ انشا کردہ ام، آدمِ حضور گواہ است کہ در چہ سراسیمگی بہ چہ زودی رقم زدہ ام۔ حاشا کہ جوابِ قطعۂ جناب رانمی ارزید، گویا عرض از تحریرِ آں قطعہ رسیدِ دال و آچار بود و دیگر ہیچ۔ امید کہ آں را بہ آب بشویند یا بہ آتش

> بسوزند، چہ آں را بے اعانتِ فکر بدستیاریِ خامہ نگاشتہ ام، مبادا کہ سقمے داشتہ باشد وبدستِ معاندین افتد۔ جناب را بہ سیّد الشہدا علیہ السلام سوگند کہ آں را بہ کس نمایندواز ہم بگزرانند۔ قطعۂ کہ دریں ورق مرقوم است، جوابِ قطعۂ مرقومۂ آں مخدوم است، ہر کہ خواہد، بنگرد، محابا نیست۔[۴۸]

اس خط کے مکتوب الیہ مرزا ابوالقاسم خاں غالب کے ان دوستوں میں سے تھے جو اس معرکے میں ان کے طرف دار بھی تھے اور معاون و مددگار بھی۔ مرزا احمد بیگ طپاں کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے مخالفین کے اعتراضات کے جواب اور غالب کے موقف کی تائید میں اساتذہ کے کلام سے اسناد تلاش کر کے ان کے پاس روانہ کی تھیں جنھیں انھوں نے آئندہ مشاعرے میں پیش کرنے کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ اس عنایت واعانت کے جواب میں غالب نے انھیں لکھا تھا:

> نوازش نامہ ورود نمود و آبروے خاکساری ہایم افزود۔ ہر سہ مطلع را ارواحِ ثلاثہ کالبدِ دعویٰ ساختہ بہ احتیاط نگہ داشتہ ام۔ بہ خاطر می گزرد کہ روزے چند صبر باید کرد و در محفلِ مشاعرۂ آیندہ بلند باید خواند، تا اہلِ انجمن بشنوند و رسوائیِ معترض وگراں مایگیِ معترَض بر ہمہ آشکارا گردد۔ دیگر از سپاسِ عنایتِ جناب و تشکر تفقداتِ جنابِ مستطاب مرزا ابوالقاسم خاں صاحب چہ عرضہ دارم کہ از حوصلہ کام و زباں بیش است۔ ناچار آں را حوالہ بہ دل و جاں کردہ ام۔[۴۹]

حیرت ہوتی ہے کہ اس معرکے پر تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کرنے والوں نے بھی غالب کے ہم نواؤں میں ان دونوں حضرات کے نام شامل نہیں کیے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض ایسے لوگوں کے نام اس فہرست میں شامل ہو گئے ہیں جن کی شرکت معاصر ذرائع کے مطابق یا تو نامعلوم ہے یا مشکوک ہے۔ اسی سلسلے میں سب سے مفصل بیان مالک رام صاحب کا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> غالب کی طرف سے جن لوگوں نے اعتراضات کے جواب دیے، ان میں نواب

> سید علی اکبر خاں طباطبائی (متوفا: امام باڑا، ہوگلی) مولوی محمد محسن، میرزا حسین علی خاں (سفیرِ مرزا کامراں درّانی، والیِ ہرات) الملقب بہ کفایت خاں اور مولوی عبدالکریم (میر منشیِ دفترِ فارسی گورنر جنرل) کے نام ہمیں معلوم ہیں۔[۵۰]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ سارا ہنگامہ مرزا افضل بیگ اور مولوی سراج الدین احمد کے ساز باز کا نتیجہ تھا اور یہ دونوں مولوی عبدالکریم کے عزیز و قریب اور ہم خانہ تھے، اس لیے ان کی طرف سے اس معاملے میں غالب کی ہم نوائی خارج از امکان ہے۔ مزید براں ان کا نام میاں داد خاں سیّاح کے نام کے جس خط کے حوالے سے اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے، اس کا بھی ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔ باقی نام کی غالب کی جن تحریروں سے ماخوذ ہیں، وہ بھی اول الذکر دو ناموں کی حد تک مختلف فیہ تعبیر و تاویل کی گنجائش رکھتی ہیں۔ چوتھے شخص، یعنی سفیر ہرات، کا ذکر غالب نے دو تین جگہ وضاحت کے ساتھ کیا ہے، لیکن سید لطیف الرحمان کے نزدیک عبدالصمد کی طرح اس کا وجودِ خارجی بھی مشتبہ ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> غالب نے اپنے اور دوسرے شعراے ہند کے بارے میں کفایت خاں کے تأثرات کو جس مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ...... تأثرات غالب کی ذہنی تخلیقات ہیں اور خود کفایت خاں عبدالصمد نمبر ۲ ہے۔[۵۱]

چونکہ کفایت خاں کا ہندوستان آنا اور کلکتے میں قیام کرنا دستاویزی طور پر ثابت ہے،[۵۲] اس لیے اسے عبدالصمد کی طرح غالب کے ذہن و دماغ کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ ممکن ہے کہ غالب نے اس کی تحسین و تعریف کے بیان میں مبالغے سے کام لیا ہو۔

نواب علی اکبر خاں طباطبائی اور مولوی محمد محسن کی طرف سے اعتراضات کے جواب دینے کا ذکر ''پنج آہنگ'' میں شامل مولوی محمد علی خاں کے نام ایک خط میں اس طرح آیا ہے:

> کلانانِ انجمن و فرزانگانِ فن بر دو بیتِ من اعتراضِ نادرست بر آوردہ آں را شہرت می دہند و بے آں کہ زباں بہ پاسخ آشنا شود، از دانشوراں کہ مخدومی و ملاذی نواب علی

اکبر خاں ومکرمی ومطاعی مولوی محمد محسن از آنا نند۔ جواب ہا می یابند وپس (بہ)
زانوے خاموشی می نشینند۔[53]

''نامہ ہاے فارسیِ غالب'' میں اس خط کا متن کافی مختلف ہے۔ وہاں لکھتے ہیں:

کلانانِ انجمن وگراں مایگان (فن) (بردوبیتِ من) اعتراضِ نادرست برآوردہ
آں را بنامِ بعضے از سفہا شہرت دادند، جواب ہا یافتند وپس بہ زانوے خموشی
نشستند۔ (مخدومی وملاذی نواب علی اکبر خاں) دریں داوری بامن ہم زباں بودہ
اندوشوریدگاں رابہ حسنِ ادا فرونشانیدہ۔[54]

غالب طباعت کے وقت اپنی تحریریں میں جس وسیع پیمانے پر ردوبدل کرتے رہے ہیں اور لفظی ومعنوی، دونوں سطحوں پر انھوں نے بلا تکلف وتامل جس قسم کی تبدیلیاں کی ہیں، اہلِ علم ان سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے بات وہی صحیح معلوم ہوتی ہے جو ''نامہ ہاے فارسیِ غالب'' میں کہی گئی ہے۔ یہاں مولوی محمد محسن کا نام یک سر موجود نہیں، اور کسی دوسری تحریر سے بھی اس معاملے میں ان کی شمولیت کی تائید نہیں ہوتی، اس لیے مولوی عبدالکریم کی طرح انھیں بھی اس بحث کے شرکا کی فہرست سے خارج سمجھنا چاہیے۔ علی اکبر خاں طباطبائی کی ''ہم زبانی'' کی نوعیت بھی قدرے مختلف ہے۔ وہ کلکتہ شہر سے کافی فاصلے پر ہوگلی میں رہتے تھے، اس لیے مدرسۂ عالیہ کے مشاعروں میں ان کی شرکت بظاہر مستبعد ہے، لیکن وہ غالب کے دوستوں اور بہی خواہوں میں تھے، اس بنا پر اس تنازع میں ان کی دل چسپی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان حالات میں غالب کا یہ بیان کہ:

نواب علی اکبر خاں......شوریدگاں رابہ حسنِ ادا فرونشانیدہ

زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ مختلف بیانات سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ جب مخالفین اپنے پے بہ پے حملوں کے باوجود غالب کو زیر نہ کر پائے اور ان کے جوابی حملوں کا ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو ایک ''بزرگ'' نے نواب علی اکبر خاں کے پاس جا کر ان سے ان کے اس ''نیاز مند'' کی مبیّنہ ''شوخی وزباں درازی'' کی شکایت کی، جس کے بعد موصوف نے اپنے ''حسنِ ادا'' یعنی فراست وتدبر

سے اس مسئلے کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھا دیا، اور اس طرح باہمی مصالحت کے ساتھ یہ جھگڑا رفع دفع ہو گیا۔ تفصیل خود غالب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

بزرگے ہم ازاں گروہ پیشِ قبلہ وکعبہ نواب سید علی اکبر خاں رفت وگلہ آغاز کرد کہ اسد
اللہ دہلوی از نیاز منداں شماست، در انجمن شوخی می کند وادب نگاہ نمی دارد۔ در دعوٰی
زباں دراز است ودر خشم سبک تاز۔ در مشاعرہ باہمہ رانکو ہیدہ مگر ہم دراں
صحبتے...... بزبانم گزشتہ بود کہ آوخ مخاطبِ صحیحے وپارسی دانِ مسلّمے درمیاں نیست
تا عیارِ معترض فرا گرفتے وبہ دردِ دلِ معترض وا رسیدے۔ ہمانا بزرگے کہ شکایتِ
من بہ نواب علی اکبر خاں بہادر بردہ بود، ایں کلمۂ دردمندانہ را آب وتابِ شگرف
دادو بہ پایۂ نکوہش فرود آورد۔[55]

اس کے بعد کسی اتفاقیہ صحبت میں یا طے شدہ ملاقات کے دوران نواب صاحبِ موصوف اور غالب کے درمیان اس سلسلے میں جو مکالمہ ہوا، اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے سرِ مشاعرہ اعتراضات کے جواب دینے یا یک طرفہ طور پر غالب کی حمایت کرنے کی بجائے حسبِ ضرورت تفہیم وتادیب سے کام لیتے ہوئے فریقین کی آتشِ غضب کو فرو کر کے ایک ثالث یا مصلح کا کردار انجام دیا تھا۔ خود غالب کا بیان ہے:

نواب علی اکبر خاں پندم دادند وسرزنشم کردند وگفتند: ویحک اے فلاں! مگر بہ سخن پروری وشعر گوئی
آمدۂ؟ ہشدار کہ رہ دشوار است ورہزن بسیار۔
گفتم: چہ کنم تا ملامت را سزاوار نہ باشم؟
گفتند: دعویٰ بگزار وباہمگناں بساز۔
گفتم: دعویٰ گزاشتم اما ساختن ندانم کہ چہ می خواہد؟
گفتند: برخیز وبہ معذرت شتاب تا دلِ خلق از تو نرنجد۔
گفتم: طریقِ پورزش ورسم وراہِ عذر خواہی ہم بفرمایند۔
گفتند: فصلے در عذر بنویس وآں ورق را بمن بفرست تا بہ حضرات نمایم وزنگِ ملال از مرآتِ

قلوب بزدایم۔

چوں سخن از تہِ دل بود، ہم بہ دل فرورفت۔ مثنویؑ گفتم وآں را ’’آشتی نامہ‘‘ نام دادم، بہ خدمتِ ناصحِ محسن مدظلّہ العالی فرستادم۔ [۵۶]

اس مثنوی کی تصنیف کے بعد بظاہر یہ تنازع ختم ہوگیا اور فریقین نے ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی اور معرکہ آرائی بند کردی، لیکن چوں کہ اس مناقشے کی نوعیت ادبی نہیں، سیاسی تھی اور معاملہ علم اور اہلِ علم کی حرمت وعزّت سے زیادہ مفاد اور انا کے تحفظ کا تھا، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ دلوں کی آگ بہت دنوں تک ٹھنڈی نہ ہوسکی۔ اس کا اندازہ مولوی سراج الدین احمد کے نام غالب کے ایک خط کے اندراجات سے ہوتا ہے:

جبیں بہ خاکِ عجز سودم، نہ پزیرفتند، راہِ پوزش واعتذار پیمودم، مرحبا ے نہ گفتند۔ بہ حیرتم کہ بزرگانِ انجمن را کدام خدمتِ شایستہ بجا آرم تا در خورِ تحسیں شدہ باشم۔ [۵۷]

یہ خط مولوی صاحب کے جس خط یا زبانی پیغام کے جواب میں لکھا گیا تھا، اس میں انھوں نے غالب کو کرائے کا مکان چھوڑ کر اپنے ساتھ رہنے کی پیش کش کی تھی۔ اس تجویز کو بجا طور پر مصالحت اور تعلقات کی استواری کی طرف ایک مثبت اقدام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف اس خط میں غالب کا لہجہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس مناقشے کے طول سے تنگ آچکے تھے اور ذہنی طور پر سخت پریشان اور مضطرب تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں بعد کے دنوں میں طرفین کی جانب سے مزید نرم روی اور مصالحت کیشی کا مظاہرہ ہوا ہوگا، چنانچہ رفتہ رفتہ دلوں کی کدورت دور ہوگئی اور وہی مولوی سراج الدین احمد جو کبھی مرزا صاحب کی ’’تخریب وتذلیل‘‘ کے درپے تھے ان سے اتنے قریب ہوگئے کہ ’’مخلصِ صادق الولا‘‘ کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ ایک ناخوشگوار واقعے کا یہ خوش آئند انجام اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک طرف تو غالب کے ذخیرۂ کلام میں تاریخی وسوانحی نقطۂ نظر سے ایک نہایت دل چسپ اور معلومات افزا مثنوی کا، جو عام طور پر ’’بادِ مخالف‘‘ کے نام سے معروف ہے، اضافہ ہوا اور دوسری طرف مولوی سراج الدین احمد کے نام خطوط کا وہ بیش قیمت سرمایہ وجود میں آیا جسے مکتوب نگار کی شخصیت

وسیرت کے مختلف پہلوؤں کا ایک روشن اور تابناک مرقع کہا جاسکتا ہے۔

حرفِ آخر کے طور پر یہاں اس تنازع سے متعلق مثنوی کے حوالے سے دو اور باتیں عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ فاضلِ محترم ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا یہ خیال درست نہیں کہ اس مثنوی کا اصل نام ’’آشتی نامہ‘‘ نہیں، ’’بادِ مخالف‘‘ ہے۔ موصوف نے اپنے ایک گراں قدر مقالے میں مثنوی کی آخری بیت نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

’’ذکرِ غالب‘‘...... میں مالک رام نے......اس سے استخراج کیا ہے کہ:

جب یہ مثنوی لکھی گئی ہے تو اس کا نام ’’آشتی نامہ‘‘ تھا، نہ کہ ’بادِ مخالف‘‘۔ یہ نام بعد کو شاید ترتیبِ دیوان کے وقت رکھا گیا۔

......’’متفرقاتِ غالب‘‘ میں اس کا نام ’بادِ مخالف‘‘ ہی ہے۔ مسعود صاحب (پروفیسر سید مسعود حسن رضوی) نے مقدمے میں......لکھا ہے:

یہ مثنوی غالب کے کلیاتِ نظم میں ’’بادِ مخالف‘‘ کے نام سے شامل ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اس عنوان (’’آشتی نامہ‘‘) سے مخطوطے میں نقل نہیں ہوئی ہے۔ ’’آشتی نامہ‘‘ اس کا عنوان نہیں تھا۔ ورنہ اسی عنوان سے مخطوطے میں ہوتی۔ [۵۸]

واقعہ یہ ہے کہ ’’متفرقاتِ غالب‘‘ جس بیان پر مبنی ہے، اس میں اس مثنوی کی پیشانی پر کسی نام کی بجائے صرف ’’یا اسد اللہ الغالب‘‘ لکھا ہوا ہے، اس لیے اس سلسلے میں رضوی صاحب کا بیان روایتِ عام کی بازگشت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ مالک رام صاحب نے بر بنائے قیاس جو نتیجہ اخذ کیا تھا ’’نامہ ہاے فارسیِ غالب‘‘ کی دریافت نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے۔ اس مجموعے سے گذشتہ سطور میں نقل کردہ اقتباس میں غالب نے واضح طور پر یہ لکھ دیا ہے کہ:

مثنوی گفتم وآں را ’’آشتی نامہ‘‘ نام دادم۔

اس کے بعد اس معاملے میں کسی اختلافِ رائے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

دوسری نسبتاً غیر اہم تاہم قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے اپنے خطوط کے لیے مستقل اختتامیہ فقرے کے طور پر ’’والسلام والاکرام‘‘ کا انتخاب بہ گمانِ غالب اسی ’’آشتی

نامۂ ودادانجام'' کی آخری بیت کے مصرع سے کیا تھا۔ حالاں کہ صحیح ترکیب ''والسّلام مع الاکرام''
ہے، اوراس سے غالب اور مالک رام دونوں بخوبی واقف تھے۔ غالب نے ضرورتِ شعری کے
تحت اور مالک رام نے محض ان کے اتباع میں اس تصرّف کو جائز رکھا ہے۔

(شش ماہی غالب، ادارہ یادگارغالب کراچی، شمارہ۱۹، ۲۰۰۰ء، ص۱۱۵۔۱۴۱)

حواشی:

۱۔ ''نامہ ہائے فارسیِ غالب''، مرتّبہ: سیداکبرعلی ترمذی، مطبوعۂ دہلی، ۱۹۶۹ء، ص۳۸

۲۔ ''ذکرِ غالب'' از مالک رام، شائع کردہ، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، طبعِ پنجم، فروری۱۹۷۶ء، ص۶۷

۳۔ ''غالب نامہ'' از شیخ محمد اکرام، طبعِ اوّل، ص۴۷

۴۔ ''نامہ ہائے فارسیِ غالب''، ص ص۲۱۔۲۰

۵۔ ایضاً، ص۲۱

۶۔ ماہ نامہ ''ماہِ نو''، کراچی، شمارہ: جنوری فروری۱۹۶۹ء (غالب نمبر)، ص۴۲

۷۔ ایضاً، ص ص۴۳۔۴۲

۸۔ ''کلیاتِ نثرِ غالب''، مطبوعۂ نول کشور لکھنؤ، جنوری۱۸۷۱ء، ص ص۱۴۱، ۱۵۱

۹۔ ایضاً، ص۱۶۲

۱۰۔ ''ذکرِ غالب''، ص۶۷

۱۱۔ مجلّہ ''نقوش''، لاہور، شمارہ: ستمبر۱۹۸۱ء (ادبی معرکے نمبر، جلد دوم)، ص۳۴۵

۱۲۔ ''کلیاتِ نثر غالب''، ص۱۷۰

۱۳۔ ''نامہ ہائے فارسیِ غالب''، ص۴۰

۱۴۔ ایضاً، ص۸۸

۱۵۔ ''مآثرِ غالب''، طبعِ ثانی، شائع کردہ، ادارہ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ، ۱۹۹۵ء ص۲۴

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ماہ نامہ ''ماہِ نو'' شمارۂ مذکورۃ الصدر، ص۵۵

۱۸۔ ایضاً، ص۵۷

۱۹۔ ''ذکرِ غالب''، حاشیہ ص۶۷

۲۰۔ ماہ نامہ ''ماہِ نو'' شمارۂ مذکورۃ الصدور، ص۵۵

۲۱۔ ''نامہ ہائے فارسیِ غالب''، ص۱۰۲

۲۲۔ بحوالۂ ''ذکرِ غالب''، ص۶۹

۲۳۔ ''غالب نامہ''، ص ۷۸

۲۴۔ ''نقشِ آزاد''، مرتّبہ: مولانا غلام رسول مہر، شائع کردہ، کتاب منزل، لاہور، غالبًا ۱۹۵۵ء، ص ۲۷۹

۲۵۔ ماہ نامہ ''ماہِ نو''، شمارۂ مذکورۃ الصدور، ص ۵۵

۲۶۔ ایضاً ص ۵۷

۲۷۔ ''ذکرِ غالب''، ص ص ۷۰۔۶۹

۲۸۔ ''ذکرِ غالب''، ص ۶۹، ماہ نامہ ''نقوش''، مذکورۃ الصدور، ص ۳۴۷

۲۹۔ ''سخنِ شعرا''، مطبوعہ مطبعِ نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۳۴۹

۳۰۔ ''غالب اور ان کے معترضین''، شائع کردہ، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ، جنوری ۱۹۷۳ء، ص ۹۰

۳۱۔ بنگال میں اردو زبان و ادب''، شائع کردہ، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، ص ص ۶۸، ۸۷

۳۲۔ ''گل رعنا''، مرتبہ: مالک رام، شائع کردہ علمی مجلس، دلّی، ۱۹۷۰ء، ص ۴

۳۳۔ ''نقشِ آزاد''، ص ۲۷۹

۳۴۔ ''نقوش''، شمارۂ مذکورۃ الصدر، ص ۳۴۷

۳۵۔ ''مآثرِ غالب''، طبعِ ثانی، ص ۱۷۔۱۶

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ ''نقوش''، لاہور، شمارۂ مذکورۃ الصدر، ص ۳۴۵

۳۸۔ ''ذکرِ غالب''، ص ۶۷

۳۹۔ ''نقوش''، شمارۂ مذکورۃ الصدر، ص ۳۴۶

۴۰۔ ''نامہ ہائے فارسیِ غالب''، ص ۴۰

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۴۴۔ ''نقوش''، شمارۂ مذکورۃ الصدر، ص ۳۴۶

۴۵۔ ''مآثرِ غالب''، طبعِ ثانی، ص ۱۶۔۱۷

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ ''یادگارِ غالب''، عکسی ایڈیشن، شائع کردۂ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۲۰

۴۸۔ ''متفرقاتِ غالب''، مرتّبۂ پروفیسر مسعود حسن رضوی، طبعِ ثانی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۹

۴۹۔ ''مآثرِ غالب''، طبعِ ثانی، ص ۱۵

۵۰۔ ''نقوش''، شمارۂ مذکورۃ الصدر، ص ۳۴۷

۵۱۔ ''غالب اور ان کے معترضین''، ص ۹۷

۵۲۔ ''ذکرِ غالب''، حاشیہ ص ۷۰

۵۳۔ ''کلیاتِ نثرِ غالب''، ص ۱۷۰

۵۴۔ ''نامہ ہائے فارسیِ غالب''، ص ۵۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۵۷۔ ''مآثرِ غالب''، طبعِ ثانی، ص ۲۴

۵۸۔ شش ماہی ''غالب نامہ''، نئی دہلی، شمارہ: جنوری ۱۹۹۳ء (مسعود حسن رضوی نمبر)، ص ۹۸۔۹۷

ڈاکٹر شان الحق حقی

کلام غالب کا لسانی تجزیہ

درازی شب ہجراں ز حد گزشت ، بیا
فدائے روئے تو عمر ہزار سالۂ ما

اس شعر میں غالب نے اپنی عمر کا اندازہ ہزار سال کیا تھا، جس میں سے اب خیر سے دوسو برس گزر چکے ہیں۔ غالباً سوچا ہوگا کہ اس مدت میں قیامت بہرحال آ ہی جائے گی۔ لہٰذا ہزار سال کو عمر دوام ہی سمجھنا چاہیے۔ اس دوصد سالہ سالگرہ پر ادبی دنیا میں ان کی یاد تازہ ہوئی اور ذہن ان کے اور ان کے کلام کی بابت کچھ نئے پہلوؤں سے سوچ بچار پر مائل ہوئے۔ زیرِنظر مطالعہ بھی اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ غالبیات ویسے بھی ایک دوامی موضوع فکر ہے۔ ہر عہد کے متجسس اذہان کو اپنے ادبی سرمایے پر اپنی فہم اور اپنے وجدان کے مطابق نئی تفہیم کا حق حاصل ہے۔ بڑے ادب کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس میں سے نئے رموز و نکات نکلتے چلے آئیں۔ بعض اوقات شاعر کو خود بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ روح عصر بڑے پراسرار طور پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ مبدءِ غیب سے کچھ ایسے سربستہ پیغام بھی آتے ہیں جن کے مضمرات آگے چل کر کھلیں۔

غالب کے ریختہ رشک فارسی کی مقدار دوسرے اساتذہ کے دواوین کے مقابلے میں زیادہ نہیں، سب کچھ ملا کر بھی اکثر سے کمتر ہے، لیکن جہاں تک فراوانی الفاظ کا تعلق ہے ان کا سرمایہ لغات نہ صرف بلحاظ تناسب بلکہ مقدار میں کم نہیں خصوصاً جبکہ لغات کے تنوع بلکہ ان کی اپنی اختراعات کو بھی نظر میں رکھا جائے کہ یہ اجتہادی توفیق بھی بڑی شاعری کی ایک پہچان ہے جو کم ہی

شاعروں کے حصے میں آتی ہے۔ غالب نے جس قدر جدت تراکیب سے کام لیا ہے کسی شاعر نے نہیں لیا۔

اب سے بہت پہلے میں نے غالب کی امیجری (تخیّلات یا استعارات) کے تجزیے سے دریافت کیا تھا کہ انھوں نے سب سے زیادہ جس لفظ سے کام لیا ہے وہ ”آئینہ“ ہے، جو بطور استعارہ نیز بطور لغت ہر لفظ سے کہیں زیادہ مجرداً یا طرح طرح کی انوکھی تراکیب میں واقع ہوا ہے۔ یہ بڑا پُرمعنی استعارہ ہے جو ایک طرف ان کی الٰہیات سے تعلق رکھتا ہے، یعنی یہ نظریہ کہ ہستی حقیقت اصلی کا ایک پرتو ہے نہ کہ اصل حقیقت یا قائم بالذات وجود۔ دوسری طرف لڑکپن کی نرگسیت سے کہ آئینے کی بھرمار ابتدائی کلام میں زیادہ ملتی ہے، بعد میں کم ہوگئی۔ اس میں کچھ بیدل کی پیروی کو بھی دخل ہے، کیوں کہ فارسی شعرا میں آئینے کا بے تحاشا استعمال جیسا بیدل کے ہاں ملتا ہے دوسرے شعرا کے ہاں اس کے عشرعشیر بھی نہیں۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ اعداد و شمار بھی پیش کیے تھے (غالب کے مرغوب استعارے مشمولہ ”نکتہ راز“ ۱۹۷۲ء)

اسی سلسلے میں ”کارڈ انڈیکس“ کے ذریعے (یعنی ہر لفظ کی علاحدہ پرچی بنا کر) الفاظ شماری کی تو ظاہر ہوا کہ غالب نے اپنے تمام اردو کلام میں، مکرّرات کو چھوڑ کر، چھ ہزار سے کچھ زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میں نے اختراعی تراکیب کو شامل رکھا ہے بلکہ عام اجزائے کلام، حروف ضمائر وغیرہ کو بھی شمار میں لیا ہے، مثلاً کہیں ضمیر واحد متکلم بہت زیادہ آئے تو معنی خیز ہو سکتی ہے، اگرچہ کلام غالب پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں کہیں ”میں“ بھی ”ہم“ یعنی ساری انسانیت کو متضمن ہوتا ہے اور کہیں ”ہم“ بھی صرف واحد متکلم کے لیے آتا ہے۔ مثلاً:

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یہاں ”مجھے“ سے مراد یہی ہے کہ ”انسان“ کو قدرت کی عطا کردہ مقدرت یا توانائی (خون جگر) کا حساب پرسش اعمال کی صورت میں دینا پڑتا ہے۔ (اگرچہ شارحین نے صرف سامنے ہی کے معنی لیے ہیں، الفاظ کے لغوی معنی، جس سے بات نہیں بنتی۔ بھلا پلکیں حساب لیں

گی، یعنی چہ؟)

دوسری طرف ''ہم'' بھی میں کا مترادف ہوسکتا ہے، مثلاً:

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

الفاظ کی ٹھیک ٹھیک تعداد طے کرنے میں کچھ پیچیدگیاں ہیں، کون سے محاورات یا مرکب افعال کو علاحدہ کلمہ شمار کیا جائے۔ دونوں افعال الگ الگ شمار ہوں تو مرکب فعل یا محاورہ ان پر مستزاد ہو یا نظرانداز، درآں حالیکہ مرکب افعال یا محاورے کے معنی مصادر کے اصل معنی سے متجاوز ہوتے ہیں۔ ''جواب دینا'' (مایوس کرنا، برطرف کرنا) کا مفہوم نہ جواب میں ہے نہ دینا میں۔ یہی مسئلہ بعض دوسرے کلمات کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے جیسے کہ فجائیہ کلمات: مت پوچھ! کیا کہوں! یا فقرے: جانے بھی دو، تکلف برطرف۔ وعلا ہذا القیاس ''کیجیے'' ''کرنا'' کی مغیرہ شکل ہے۔ کیا صرف کرنا مصدر کو گن لینا کافی ہے یا اسے ایک علاحدہ لفظ شمار کیا جائے؟ کتب لغات میں عام طور پر مغیرہ صورتیں نہیں دی جاتیں۔ فعل کا اندراج کافی ہوتا ہے، پوری گردان غیر ضروری۔ غالب نے ''ہوجیو'' ''آئیو'' بھی باندھا ہے (بطور روزمرہ ''آگے آئیو'' کی ترکیب میں) یہ بھی لغوی طور پر تو آنا کا صیغہ امر ہی ہے۔ عام اجزائے کلام جیسے کہ حروف جار میں، سے،، کو، پر، تک! نیز ضمائر وظروف ان، ان، اسی، وہیں، کہیں، وہی وغیرہ وغیرہ اور دوسرے عطفی الفاظ یا فقرے یوں تو، ویسے، اتنے میں، چلیے، ہٹائیے، چھوڑیے ہر تحریر میں لازماً شامل ہوتے ہیں کوئی خصوصیت نہیں رکھتے، مشاہدات یا روشِ فکر پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ کیا انھیں بھی گنا جائے؟ (میں نے ان کو بڑی حد تک سمیٹ لیا ہے، طے یہ کرنا ہے کہ گنتی میں لیا جائے یا نہیں، اور تمام وکمال آگئے یا نہیں)۔

بہرحال محض گنتی ہی اہم نہیں، لسانی تجزیہ کلام سے جو نکتے اور نفسیاتی پہلو ابھرتے ہیں وہ اپنی جگہ زیادہ دلچسپ اور پرمعنی ہیں۔ ذیل میں چند ایسے ہی نکات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

فجائیہ کلمات

غالب نے فجائیہ کلمات کثرت سے استعمال کیے ہیں جیسے کہ: افسوس! الٰہی شکر! اللہ رے! اللہ غنی! اے خدا! اف، آفریں! آفریں ہے! آہ! بار خدایا! یدا! برائے خدا! تماشا! پھر نہ کہیو! چشم ماروشن، حبذا! حف نظر! حیف! حیف ہے! خاک برسر، خدا خیر کرے! خدارا! خدا کرے! خدا کو مان! خدا کی پناہ! خدا کے واسطے! خدایا! خوشا! اے خوشا! دوستو! دیکھو! دیکھیے! زہے! زنہار! زینہار! مبارک، مبارک! سلامت، سلامت، سلا، مت! ظالم! عبث! عجب! عجیب! عشق ہے (بطور کلمہ تحسین)، عیاذاً باللہ! غلط! فریاد! قیامت ہے! کاش! کاشکے! کرم کر! کروں کیا! کیا جانے! کیا خوب! کیا قدرت! کیا کروں! کیا کہوں! کیا کیجیے! کیوں نہ ہو! لوحش اللہ! مباد! مبارک باد! مت پوچھ! مرحبا! مژدہ باد! معلوم! نہ پوچھ! نہ پوچھو! نہ کہیو پھر! واہ! واہ واہ! واہ رے، وائے، ہاں! ہائے ہائے، ہر چہ بادا باد! ہے غضب! ہیہات! ہے ہے! یاالٰہی! یا خدا! یاد ایامے! باد روزے! یاد رکھیے! یارب! وغیرہ

چند مثالیں دیکھیے:

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخور عقد گہر انگشت

وائے محرومی تسلیم وبدا حال، وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں

اے چرخ خاک برسر تعمیر کائنات
لیکن بنائے عہد وفا استوار تر

عیسی طلسم حسن تغافل ہے زینہار
جز پشت چشم نسخہ عرض دوا نہ مانگ

تیغ درکف، کف بلب آتا ہے قاتل اس طرف

مژدہ باد اے آرزوئے مرگ غالب مژدہ باد!

فزوں ہوتا ہے ہر دم جوش خوں باری تماشا ہے
نفس کرتا ہے رگ ہائے مژہ پر کام نشتر کا!

فنا کو عشق ہے بے مقصداں، حیرت پرستاراں
نہیں رفتار عمر تیز رو پابند مطلب ہا!

بہ کام دل کریں کس طرح گمرہاں فریاد
ہوئی ہے لغزش پا لکنت زباں، فریاد

نہ پوچھ حال شب و روز ہجر کا غالب
خیال زلف ورخ دوست صبح وشام رہا

دریغ اے ناتوانی ورنہ ہم ضبط آشنایاں نے
طلسم رنگ میں باندھا تھا عہد استوار اپنا

نامہ بھی لکھتے ہوتو بخط غبار حیف
رکھتے ہو مجھ سے اتنی کدورت ، ہزار حیف

ناز لطف عشق باوصف توانائی عبث
رنگ ہے سنگ محک دعوائے بینائی عبث

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے نا تمامی نفس شعلہ بار حیف !

آنسو کہوں کہ آہ ! سوار ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں!

دیگر عواطف ولوازم کلام

اس ضمن میں کچھ ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو ربط یا زورِ کلام یا خلاصہ کلام یا تسلسل کلام

کے لیے استعمال ہوتے ہیں، جیسے ازبسکہ یا بسکہ، القصہ، بارے، چنانچہ، غرض، الغرض یا غرضیکہ، لہٰذا، فل ہذا، یہاں چند مثالیں دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جایئے
بے تکلف اے شرار جستہ کیا ہو جایئے

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

حیرت سے ترے جلوے کی ازبسکہ ہیں بیکار
خور قطرہ شبنم میں ہے جوں شمع بفانوس

زبس آتش نے فصل رنگ میں رنگ دگر پایا
چراغ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمع خار اپنا

خاک عاشق بسکہ ہے فرسودہ پرواز شوق
جادہ ہر دشت تار دامن قاتل ہوا

ہے مگر موقوف بر وقت دگر کار اسد
اے شب پروانہ و روز وصال عندلیب

از آنجا کہ حسرت کش یار ہیں ہم
رقیب تمنائے دیدار ہیں ہم

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

حروف تشبیہ وطریق تشبیہ

استعارہ وتشبیہ ایک ہی تخیلی عمل ہے، لیکن تشبیہ میں مماثلت زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوتی ہے اور استعارے میں کنایۃً بلا حروف تشبیہ۔ غالب کے ہاں تشبیہ کے متنوع پیرائے

ملتے ہیں۔ میری دانست میں یہ بھی کلام غالب کا ایک امتیاز ہے کہ استعارے کی فراوانی کے ساتھ ساتھ تشبیہ کے اتنے پیرائے یکجا کسی اور شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ عام حروف تشبیہ کے علاوہ مثلاً :ایسا، جوں، یوں، جیسا، جیسے کہ، مثل، مانند، مانا، کہے تو، تو کہے، گویا، گوئیا، اکثر جگہ حروف تشبیہ اور مشبہ بہ ترکیب اضافی کے طور پر آتے ہیں جس کی صورتیں یوں ہیں: آسا، برنگ، بشکل، صورت، بصورت، نما، نمط، وار (بلبل وار)، ساں۔ بسان۔ صفت (مثلاً صفت آئینہ) روکش۔ آئینہ، عکس (بطور حرف تشبیہ، غالب کی جدت ہے) چند مثالیں:

صافی رخ سے ترے ہنگام شب
عکس داغ مہ ہوا عارض پہ خال

زکوۃ حسن دے اے جلوہ بینش کہ مہر آسا
چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر
رہا مانند خون بیگنہ حق آشنائی کا

بسکہ ہے مے خانہ ویراں جوں بیابان خراب
عکس چشم آہوے رم خوردہ ہے داغ شراب

خاتم دست سلیماں سے مشابہ لکھیے
سرپستان پریزاد سے مانا کہیے

داغ مہر ضبط بے جا ہستی سعی سپند
دود مجمر لالہ ساں درد تہ پیمانہ تھا

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہوگیا
تو کہے صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

''چکنی ڈلی'' کے قطعے میں، جو تشبیہات سے پر ہے، غالب نے عجیب ندرت سے کام لیا ہے، یعنی تشبیہ کا منفی انداز جس کی کوئی اور مثال میری نظر میں نہیں۔ یہ پیرایہ انھی سے مخصوص ہے۔ پے بہ

پے تشبیہات واستعارات لا کر انھیں رد کرتے جانا، گویا کہ کافی نہیں، پھر تان آخری تشبیہ پر ٹوٹتی ہے اور گویا اس کے ساتھ قلم بھی!

کیوں اسے قفل در گنج محبت لکھیے
کیوں اسے نقطہ پرکار تمنا کہیے
کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیجے
کیوں اسے مردمک دیدہ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمہ پیراہن لیلیٰ لکھیے
کیوں اسے نقش پے ناقہ سلما کہیے
بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

اسماء واعلام

کلام غالب میں اسماء واعلام بھی کثرت سے واقع ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر بطور تلمیح ہیں، اور یہ تمام تر روایتی تلمیحات ہیں:

آدم، آصف، ابراہیم، امیر حمزہ، ایوب، بہرام، باربد بہمن، پرویز، خسرو پرویز، جبریل، جم/جمشید، خضر، دارا، داراب، رضواں، رستم، روح القدس، زلیخا، سلیمان، سکندر، سنجر، سام، سلمیٰ، شیریں، طغرل، عیسیٰ، فرہاد، فریدوں، فرعون، فغفور، قیصر، قارون، قیس، کے خسرو، کنعان، لقمان، لیلیٰ، موسیٰ منصور، مجنوں، مانی، نل دمن، نمرود، یزید، یعقوب، یوسف

بعض وہ اسما جن کے مسماؤں سے دلی ارادت یا تعلق خاطر تھا، نیز ان کے القاب کنیت وغیرہ علی بوتراب حیدر، ابن علی، بے دل، امیر خسرو، چار یار، حسن، حسین، ختم رسل، ساقی کوثر، شبیرؑ، نظام الدین اولیاءؒ، حافظ شیرازی، درد، ناسخ، میر ظہوری، عرفی، غزالی، طالب

معاصرین وممدوحین میں

احسن اللہ خاں، ایلن براؤن ، ببر علی، مہاراجہ الور، تجمل حسین خاں، خضر سلطان، حاتم علی مہر، سراج الدین بہادر شاہ، سلیم خاں، شہاب الدین خاں، شیونرائن، شیفتہ، شمرو کی بیگم، علائی، سید غلام بابا، غلام نجف، طالب، طپش، طپاں مولانا شاہ فخر الدین، قاسم، حاجی، کلو، کلب علی خاں، مسٹر کوان، معتمد الدولہ، میکلوڈ نصرت الملک، نیر، واصل خاں، وکٹوریا، وحشت، میرزا یوسف۔

مقامات اور دیگر اعلام

الور، بے ستون، بدخشاں، پنجاب، پرتگال، تتار، جمنا، جوگ بابا کا مندر، حجر اسود، حیدر آباد، حلب، حرم کعبہ، ختن، دلی / دہلی، دجلہ، نیل/ رود نیل، روم، رام پور، روس، زمزم، سدرہ، سندھ، شام، صفاہاں، طوبی، کعبہ، کوثر، کربلا، کشمیر، کلکتہ، گڑگاؤں، لال ، ڈگی، لوہارو، لکھنؤ، لدھیانہ، مکہ، مصر، نجف، نخشب، ہند/ ہندوستان۔

اختراعات وجدت تراکیب

لغات کلام غالب کا امتیازی عنصر وہ لفظی اختراعات اور پر تخیل تراکیب ہیں جو انھی سے مخصوص ہیں اور بعض کا اتباع بھی ہوا، یعنی جز و زبان بن گئیں یا کتابوں کے عنوانات کے طور پر مستعار لی گئیں، ان کا سلسلہ دراز ہے:

استقبال ناز، اشک شکری، اضطراب آسودہ ، افسون آگاہی، افگندنی ، انتظار آباد، اضطراب آرا، اوج ریزی، انتظارستان، آبشار نغمہ، آتش بجان، آتشیں پانی، آغوش وداع، آشوب آگہی، آسیائے آب، آشیانہ عنقا، آفت نظارہ، آئینہ دار، آئینہ داری، آئینہ خانہ، آئینہ بند، آئینہ بندی، آئینہ ساماں، آئینہ ایجاد، آئینہ تعمیر، آئینہ کیفیت، آئینہ ساز، آئینہ پرداز، آئینہ کار، دل آئینہ، زانوئے آئینہ، بزم آئینہ تصویر، موم آئینہ ایجاد، وحدت خانہ، آئینہ دل، کشور آئینہ، تپش آئینہ، چشمہ آئینہ، رخ آئینہ، پشت آئینہ، نقش بند آئینہ، فرد آئینہ، شمع آئینہ، قبلہ آئینہ (مراد حقیقت ازلی)، آب آئینہ، حیرت

آئینہ، گداز آئینہ، گرمی آئینہ، خاکستر آئینہ، در آئینہ، دامن آئینہ، جلوۂ آئینہ۔

آئینہ دل، آئینہ چشم، آئینہ ناز، آئینہ تعمیر، آئینہ تمثال، آئینہ تصویر، آئینہ خور (بطور تشبیہ) آئینہ دیوار، آئینہ زانو (جسے زانو پر رکھ کر سنگھار کیا جاتا تھا) آئینہ دست طبیب، آئینہ گل (گل کی تشبیہ آئینے کے ساتھ)، آئینہ امتحان، آئینہ خیال، آئینہ بے رنگ، آئینہ دریا، آئینہ سنگ، آئینہ باد بہاری، آئینہ انتظار (چشم وا سے استعارہ)، آئینہ تصویر نما۔

لفظ آئینہ اور اس کی تراکیب کے سلسلے میں میرے سابقہ مقالے ''غالب کے استعارات کا بھید'' سے ذیل کا اقتباس برمحل ہوگا:

''تشبیہ واستعارہ سے قطع نظر، غالب کے محاورے میں لفظ آئینہ کے کچھ مخصوص معنی اور نیا استعمال بھی ملتا ہے۔ ان کے کلام کی روشنی میں بنیادی طور پر آئینہ فولاد کو صیقل کر کے بنایا ہوا آلہ ہے، جو صورت و منظر کو منعکس کرتا ہے۔ مثلاً:

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

اور اس میں جوہر بھی ہوتا ہے جس کی طرف کثرت سے استعارہ کیا گیا ہے اور ''جوہر آئینہ'' کو ''طوطی بسمل'' تک باندھا ہے۔ لیکن شیشے سے بنائے ہوئے مومی یا سیمابی آئینے کا ذکر بھی ان کے ہاں موجود ہے:

حیرت آفت زدہ عرض دو عالم نیرنگ
موم آئینہ ایجاد ہے مغز تمکیں !

(یعنی شاہد قدرت کی تمکین نے موم آئینہ کا کام کر کے اس کے جلوے کی جھلک دکھائی اور جذبہ حیرت ''دو عالم'' طلسم کی زد میں آ گیا)۔

بشرئیٔ خواب آلودہ مژگاں نشترِ زنبور
خود آرائی سے آئینہ طلسم موم جادو تھا

(ان دونوں مصرعوں میں خوابِ شیریں کی رعایت سے شہد کے تلازمے باندھے ہیں)۔موم جادو سے کنایہ تعویذ کی طرف ہے جیسے کہ ذیل کے شعر میں:

خود آرا وحشت چشمِ پری سے شب وہ بدخو تھا
کہ موم آئینہ تمثال کو تعویذ بازو تھا

(واضح رہے کہ تعویذ موم جامے میں لپیٹا جاتا تھا) آئینے کی مختلف صفات کی نسبت سے غالب نے اس لفظ کو مختلف معنی میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ یہ نہ صرف استعارہ بلکہ لغت بن گیا ہے:

سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دل بیقرار کے

یعنی پشت آئینہ کے لیے جو کام سیماب کرتا ہے وہ دل بیقرار ہمارے دیدہ حیراں کے لیے کر رہا ہے:

یاس تمثال بہار آئینۂ استغناء
وہم آئینہ پیدائی تمثال یقیں

اس شعر میں آئینہ دونوں جگہ مجازاً تصویر یا تمثال کے لیے بطور تشبیہ آیا ہے اور اس کا استعمال غالب کے ہاں بہت عام ہے:

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

لفظ عکس سے بھی وہ یہی کام لیتے ہیں......آئینہ دار کی ترکیب پہلے سے بندھی بندھائی تھی لیکن غالب نے اس لفظ کو ان معنی میں جس کثرت سے برتا ہے کہ وہ انھی سے مخصوص ہے:

ہوائے سیرِ گل آئینہ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

صبح سے معلوم آثار ظہور شام ہے
غافلاں آغاز کار آئینہ انجام ہے

یاس آئینہ پیدائی استغنا ہے
ناامیدی ہے پرستار دل رنجیدہ

کوہ کن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستوں آئینہ خواب گران شیریں

کوہ بے ستون کی گرانی کو خوابِ شیریں کی گرانی کا آئینہ یعنی جواب یا مثل بتایا ہے۔اس کے علاوہ غالب نے اس لفظ کو کچھ نئے معنی بھی دیے ہیں، اور آئینے سے کچھ نئے محاورات بھی پیدا کیے ہیں ۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوق ستم تو دیکھ
آئینہ تا کہ دیدہ نخچیر سے نہ ہو

یہاں ''آئینہ ہونا'' مقابل آنے کے معنی میں ہے جو غالب کی اپنی اختراع ہے مکرر:

ہرزہ ہے نغمہ زیروبم ہستی و عدم
لغو ہے آئینہ فرق جنون و تمکیں!

یہاں آئینہ کے لفظ سے تضاد کا مفہوم پیدا کیا ہے۔جنون و تمکیں کے فرق کو آئینہ کہا ہے جس میں دونوں ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں۔

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی
غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے

یعنی پھول میں ساری بہار اس طرح منعکس ہو رہی ہے جس طرح آئینے میں سارا منظر سمایا ہوا ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کائنات کی بہار (یا رونق) کا تعلق ہے گل سے مراد دل ہے اسی کے اندر جلوہ قدرت دیکھنا چاہیے۔ یہاں آئینے کے لفظ سے ''خلاصہ'' کے معنی پیدا ہوئے مکرر:

کیوں نہ طوطی طبیعت نغمہ پیرائی کرے

باندھتا ہے رنگ گل آئینہ تاچاک قفس

یہاں ''آئینہ باندھنا'' ایک نیا محاورہ استعمال ہوا ہے، جسے آئینہ بندی کا ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔

دیدہ حیرت کش خرشید چراغان خیال
عرض شبنم سے چمن آئنہ تعمیر آیا

یہاں آئینہ خانہ کے بندھے ہوئے لغت سے انحراف کرکے حسن ترکیب سے کام لیا ہے اور چمن کو ''آئینہ تعمیر'' بتایا ہے۔ یہ گویا ترکیب اضافی مقلوب ہوئی۔ یک جہاں، یک بیاباں وغیرہ غالب کا مرغوب پیرایہ اظہار ہے جس سے وہ مبالغے کا کام لیتے ہیں۔ اسی نمونے پر ''یک آئینہ'' اور ''صد آئینہ'' بھی موجود ہے:

دیدہ تادل ہے یک آئینہ چراغاں، کس نے
خلوت ناز پہ پیرایہ محمل باندھا
سبحہ واماندگی شوق و تماشا منظور!
جادے پر زیور صد آئنہ منزل باندھا

بعض جگہ آئینے کا لفظ نہیں آنے پایا، لیکن آئینے کا استعارہ بالکنایہ موجود ہے، جیسے اس شعر میں آئینہ حلبی کی طرف تلمیح کی گئی ہے:

چمن میں کس کی یہ برہم ہوئی ہے بزم تماشا
کہ برگ برگ سمن شیشہ ریزہ حلبی ہے

محبوب کو ماہ سیما ''ماہ رخ'' ماہ طلعت وغیرہ تو اور شاعروں نے بھی کہا ہے لیکن غالب اس کی صفائے پیشانی کو آئینے سے تشبیہ دیتے ہیں اور ''آئینہ سیما'' کہتے ہیں۔

سچ کہتے ہو خودبین وخودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بت آئنہ سیما مرے آگے
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئنہ سیما نہ ہوا

احوالِ غالب

انھوں نے اپنی ایک نہایت دلگداز لیکن کم معروف فارسی نظم میں آئینے کا لفظ خود اپنی نسبت بھی استعمال کیا ہے:

منم آئینہ و ایں حادثہ زنگ است والے
تاب بدنامی آلائش زنگم نبود

انھوں نے اپنے لڑکپن میں ضرور آئینے میں چاند دیکھ رکھا تھا۔ ان کا یہ کلام جس میں آئینے کی اتنی بھرمار ہے بیشتر ان کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ان کے نوخیز وجدت طراز تخیل کے لیے ایک مفید علامت بھی تھا اور عہد برنائی میں ان کے خود پسند نفس کے لیے ذریعہ تفاخر وتسکین بھی۔
غالب نے خود آئینے کو خودبینی وخودآرائی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے:

خود پرستی سے رہے باہم دگر ناآشنا
بے کسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا
جوہر ایجاد خط سبز ہے خود بینی حسن
جو نہ دیکھا تھا سو آئینے میں پنہاں نکلا
بےخبر مت کہہ ہمیں بے درد، خودبینی سے پوچھ
قلزم ذوق نظر میں آئینہ پایاب تھا
مگر ہو مانع دامن کشی ذوق خود آرائی
ہوا ہے نقش بند آئنہ سنگ مزار اپنا
نگاہ چشم حاسد وام لے اے ذوق خودبینی
تماشائی ہوں وحدت خانہ آئینہ دل کا
عکس رخ افروختہ تھا تصویر بہ پشت آئینہ
شوخ نے وقت حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا
یک نگاہ گرم ہے جوں شمع سرتاپا گداز
بہر از خود رفتگاں رنج خود آرائی عبث

بدگماں کرتی ہے عاشق کو خود آرائی تری
بے دلوں کو ہے برات اضطراب آئینے پر

گداز موم ہے افسون ربط پیکر آرائی
نکالے کب نہال شمع بے تخم شرار آتش

تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

بجز دیوانگی ہوتا نہ انجام خود آرائی
اگر پیدا نہ کرتا آئنہ زنجیر جوہر کی

نظر پرستی و بے کاری و خود آرائی
رقیب آئنہ ہے حیرت تماشائی

ہوا ہے مانع عاشق نوازی ناز خودبینی
تکلف برطرف آئینہ تمیزؔ حائل ہے

نیاز پردہ اظہار خود پرستی ہے!
جبیں سجدہ نشاں تجھ سے آستاں تجھ سے

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

آئینے کے دوسرے تلازمات میں حیرت، تحیر، حیرت کدہ، حیراں، حیرانی وغیرہ خاص طور پر معنی خیز اور لائق ذکر ہیں جن کی بیسیوں مثالیں کلام میں بکھری پڑی ہیں:

سادگی یک خیال شوخی صد رنگ نقش
حیرت آئینہ ہے جیب تامل ہنوز

حیرت اگر خرام ہے کارنگہ تمام ہے
گر کف دست بام ہے آئینے کو ہوا سمجھ

حیرت آئینہ انجام جنوں ہوں جوں شمع
کس قدر داغ جگر شعلہ اٹھاتا ہے مجھے

حیرت فکر سخن ساز سلامت ہے اسد
دل پس زانوے آئینہ بٹھاتا ہے مجھے

تحیر ہے گریباں گیر ذوق جلوہ پیرائی
ملی ہے جوہر آئینہ کو جوں بخیہ گیرائی

تمثال تماشاہا اقبال تمناہا!
عجز عرق شرمے اے آئینہ حیرانی

اہل بینش نے بحیرت کدہ شوخی ناز
جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

گردش ساغر صد جلوہ رنگیں تجھ سے
آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

لغوی اختراعات کے سلسلے میں لفظ آئینہ کی متنوع ندرت آفریں تراکیب اور اس کے معنوی مضمرات کی بحث کو یہاں تمام کرتے ہیں، مگر اختراعات کا سلسلہ تمام نہیں ہوا۔ ہم ابھی حرف الف ہی تک پہنچے ہیں۔ ذیل کی مثالوں سے ان کی کثرت کا اندازہ ہوگا:

ب

بادہ مرد آزما، باغبانی صحرا، بال افشانی، بال کشا، بال نفس، بہ روزگاری، بخود بالیدگی، برق خرمن، برجا ماندہ، بسمل کدہ، بلدستان مراد، بہار ایجادی، برہنہ گوئی، بہار ناز، بیابان فنا، بیتابی کمند، بے سبب آزار، بیاض دیدہ آہو، مثلاً یہ اشعار:

یکبار امتحان ہوس بھی ضرور ہے
اے جوش عشق بادہ مرد آزما مجھے

چشم گریانِ بسمل شوق بہار دید ہے
اشک ریزی عرض بال افشانی امید ہے

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب
دے بط مے کو دل دست شنا موج شراب

اے خوشا مکتب شوق و بلدستان مراد
سبق ناز کی ہے عجز کو صد جا تکرار

اسد ساغر کش تسلیم ہو گردش سے گردوں کی
کہ ننگ فہم مستاں ہے گلہ بد روزگاری کا

پ

پرستش گر، پروانہ زار، پشت چشم نیساں، پشت چشم التجا، پشت چشم زنداں، پشت دست عجز، پنبہ روزن، پنجہ خورشید، پیراہن کاغذ ابری، مثلاً:

بت کدہ بہر پرستش گری قبلہ ناز
باندھے زنار رگ سنگ، میان کہسار

اے کرم نہ ہو غافل ورنہ ہے اسد بے دل
از گہر صدف گویا پشت چشم نیساں ہے

بسکہ ہر یک موے زلف افشاں سے ہے تار شعاع
پنجہ خرشید کو سمجھے ہیں دست شانہ ہم

ت

تاپاک وصال، تحیر آباد، تر جبینی تخم شرار، تحیر کدہ، تسکیں خیز، تماشا کردنی، تماشا دوست، تمکین جنوں، تیرہ کاری، تشنہ سرشار، تنگ پیرہنی، تنگی چشم حسود، تیرہ کاری، مثلاً:

تماشا کردنی ہے انتظار آباد حیرانی
نہیں غیر از نگہ جوں نرگستاں فرش محفل ہا

خیال شربت عیسیٰ گداز تر جبینی ہے
اسد ہوں مست دریا بخشی ساقی کوثر کا

اے ہر زہ روی منت تمکین جنوں کھینچ
تا آبلہ محمل کش موج گہر آوے

ج

جان برلب آمدہ، جاں دادۂ ہوا، جلوہ ریزی، جلوہ زار، جفا مشرب، جلوہ برق فنا، جلوہ مایوس، جنوں جولاں، جنبش بال جبریل جوہر تیغ کہسار، جوہر مژگاں، جمعیت آوارگی، جوش شرر، جیب خیال، مثلاً:

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو
جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

سیہ چشمی چشم شوخ سے ہیں جوہر مژگاں
شرار آسا ز سنگ سرمہ یکسر بار جستن ہا

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجہ، مژگان آہو پشت خار اپنا

چ

چراغانِ خیال، چراغ خانہ درویش، چراغ رہگزارِ باد، چشمِ دام، چمنِ عارض، چمن فکر، چشمِ قربانی، چشم برپادوختہ، چیدنِ دامن خاشاک، چشمک طوفاں زدہ:

گر بہ سرشاری شوق بہ بیاباں زدہ ہے
قطرہ خون جگر چشمک طوفاں زدہ ہے

زکوٰۃ حسن دے اے جلوہ بینش کہ مہر آسا
چراغ خانہ درویش ہو کاسہ گدائی کا

شرم ہے طرز تلاش انتخاب یک نگاہ
اضطراب چشم برپا دوختہ غماز ہے

ہوا نہ مجھ سے بجز درد حاصل صیاد
بسان اشک گرفتار چشم دام رہا

عرض وحشت پر ہے ناز ناتوانی ہائے دل
شعلہ ہے پردہ چیدن دامن خاشاک ہے

ح

حیرت انشائی، حیرت ایما، حیرت آرا، حیرت کش، حیرت فروش، حیرت کدہ نقش خیال، حریرِ سنگ، حبابِ موجہ رفتار، حنائے پائے اجل، حنائے پائے خزاں، حریف مطلب مشکل، حلقہ دام خیال، حلقہ بیرون در، حل معمائے آگہی:

عبرت طلب ہے حل معمائے آگہی
شبنم گداز آئینہ اعتبار ہے

پر طاؤس ہے نیرنگ داغ حیرت انشائی
دوعالم دیدہ بسمل چراغاں جلوہ پیمائی

اہل بینش نے بحیرت کدہ شوخی ناز
جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے شوق کم میرا
حباب موجہ رفتار ہے نقش قدم میرا

بہار حیرت نظارہ سخت جانی ہے
حنائے پائے اجل خون کشتگاں تجھ سے

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

مرگ شیریں ہوگئی تھی کوہکن کی فکر میں
تھا حریر سنگ سے قطع کفن کی فکر میں

خ

خال رخ زنگی، خاطر افروزی، خاکبازی امید، خار سر دیوار، خندہ دل، خندہ دنداں نما، خیال آباد، خمیازہ ساحل، خمیازہ طرب، خضر آباد آسائش، خون آدینہ (دھنک)، خجالت گاہ پیدائی، خمار رسوم وقیود، خمار گاہ قسمت، خوان گفتگو، خون گرم دہقان، خواب سنگیں:

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچہ گل کا صدائے خندہ دل ہے

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبح وطن ہے خندہ دنداں نما مجھے

جہاں مٹ جائے سعی دید خضر آباد آسائش

بجیب ہرنگہ پنہاں ہے حاصل رہنمائی کا
ہے تصور صافی قطع نظر از غیر یار

لختِ دل سے لاوے ہے شمع خیال آباد گل
خراب آباد غربت میں عبث افسون ویرانی

گل از شاخ دور افتادہ ہے نزدیک پژمردن
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوان گفتگو پر دل وجاں کی میہمانی

د

دام گاہ، دام تمنا، دام تہ سبزہ، دامان خیال یار، دامان باغباں، دشت امکاں، درس دفتر امکاں، دست برہم سودہ، دست تہ سنگ آمدہ، دست پرنگار، دل شب، دوش دل، دود چراغ کشتہ، دزدیدہ نفس:

رہنے دو گرفتار بہ زندان خموشی
چھیڑو نہ مجھ افسردہ دزدیدہ نفس کو

رہا نظارہ وقت بے نقابی آب پر لرزاں
سرشک آگیں مژہ سے دست از جاں شستہ بررو تھا

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دوعالم دشت کا شیرازہ تھا

رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے
نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے

خیال مرگ کب تسکیں، دل آزردہ کو بخشے
مرے دام تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

ذ

ذوق سرشار، ذوق خامہ فرسا، ذرہ صحرا دست گاہ:

ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موجِ خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

یہ جانتاہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

ر

رمز چمن ایمائی، رقص شرر، رفتۂ رفتار، رگِ دام، رگِ بستر، رگِ خواب، رنگ ریزی ہائے خود بینی، ریشم کدہ، ریشۂ روزن:

ہے تماشا حیرت آبادِ تغافل ہائے شوق
یک رگ خواب و سراسر جوش خون آرزو

باغِ خاموشیِ دل سے سخنِ عشق اسد
نفسِ سوختہ رمزِ چمن ایمائی ہے

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہوتے تک

دیکھ تری خوے گرم دل بہ تپش رام ہے
طائر سیماب کو شعلہ رگ دام ہے

بے خود زبسکہ خاطر بیتاب ہوگئی
مژگان باز ماندہ رگ خواب ہوگئی

خانہ ویراں سازی وحشت تماشا کیجیے
صورت نقش قدم ہوں رفتہ رفتار دوست

ز

زانوئے تامل، زخم روزن در، زمرد رقمی، زمین ناوک خیز، زنا روا گستہ، زوال آمادہ زندان بیتابی، زندان تحمل، زندان خموشی، زنجیر رسوائی، زنجیری دود سپند، زورق خودداری، زیارت گاہ حیرانی:

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجیے خیال
دیدہ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے

دل سراپا وقف سودائے نگاہ تیز ہے
یہ زمیں مثل نیستاں سخت ناوک خیز ہے

نہ پوچھ سینہ عاشق سے آب تیغ نگاہ
کہ زخم روزن در سے ہوا نکلتی ہے

عدم ہے خیرخواہ جلوہ کو زندان بیتابی
خرام ناز برق خرمن سعی پسند آیا

جوہر آئینہ فکر سخن موے دماغ
عرض حسرت پست زانوئے تامل تاچند

زندان تحمل میں مہمان تغافل ہیں

بے فائدہ یاروں کو فرق غم و شادی ہے

س

سازعشرت، سازفسانگی سخن بے صدا، سردیوار جو، سرشک، سربصحرا ادادہ، سراب سطر آگاہی، سروبرگ آرزو، سرمہ مفت نظر، سواد دیدہ آہو، سویداے بہار:

واں ہجوم نغمہ ہائے ساز عشرت تھا اسد
ناخن غم یاں سرتار نفس مضراب تھا

سرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

اسد کو حسرت عرض نیاز تھی دم قتل
ہنوز یک سخن بے صدا نکلتی ہے

دیکھتاہوں وحشت شوق خروش آمادہ سے
فال رسوائی سرشک سر بصحرا دادہ سے

سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار
سایہ لالہ بے داغ سویداے بہار

اگر وحشت عرق افشان بے پروا خرامی ہو
بیاض دیدہ آہو کف سیلاب ہوجاوے

ش

شبنمستان، شب پروانہ، شب سیہ روزی، شبنم آگہیں، شبستان دل پروانہ، شرار جستہ، شررآبادر سخیر، شررستان، شگفتن گلہائے ناز، شگفتن گلہائے عیش، شکنج جستجو، شکنج یاس، شعلہ آواز، شعلہ خرامی، شعلہ حسن، شفق کدہ راز

فروغ شعلہ خس یک نفس ہے

ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرواز ہے
شعلہ تو کہوے کہ دودشعلہ آواز ہے

کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہوجایئے
بے تکلف اے شرار جستہ کیا ہوجایئے

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

وحشت بہارِ نشہ و گل ساغرِ شراب
چشم پری شفق کدۂ راز ہے مجھے

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ص

صبح رخساراں، صدمہ ضرب المثل، صحرائے نظربازی، صورت خانہ خمیازہ، صد نگرانی:

حیرت فروشِ صد نگرانی ہے اضطرار
ہر رشتہ چاک جیب کا تارِ نظر ہے آج

عجب اے آبلہ پایانِ صحرائے نظربازی
کہ تارِ جادۂ رہ رشتۂ گوہر نہیں ہوتا

اسد کی طرح میری بھی بغیراز صبحِ رخساراں
ہوئی شامِ جوانی اے دلِ حسرت نصیب آخر

داد از دستِ جفائے صدمۂ ضرب المثل
گرہمہ افتادگی جوں نقشِ پا ہوجایئے

شب خمار ذوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تامحیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

ض

ضبط آشنا، ضمان جادہ، ضرب تیشہ، ضبط حال خونا کردگاں:

دریغ اے ناتوانی ورنہ ہم ضبط آشنایاں نے
طلسمِ رنگ میں باندھا تھا عہد استوار اپنا

ضمان جادہ رویاندن ہے خط جام مے نوشاں
وگرنہ منزل حیرت سے کیا واقف ہیں مدہوشاں

بضرب تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
کہ ضرب تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

اے بہ ضبط حال خو ناکردگاں، جوش جنوں
نشہ مے ہے اگر یک پردہ نازک تر ہوا

ط

طاق خم شمشیر، طاق فراموشی، طرہ گیا، طشت ماہتاب، طلسم بے خبری، طلسم عرق، طلسم دل سائل، طلسم پیچ وتاب، طلسم رنگ، طلسم قفس، طوفان معانی، طوفاں کدہ، طوفان بلا:

دیکھتے تھے ہم بچشم خود وہ طوفان بلا
آسمان سفلہ جس میں اک کف سیلاب تھا

خجلت کش جفا کو شکایت نہ چاہیے
اے مدعی طلسم عرق بے غبار ہے

اسد طلسم قفس میں رہے قیامت ہے
خرام تجھ سے صبا تجھ سے گلستان تجھ سے

ہے طاق فراموشی سودائے دوعالم
وہ سنگ کہ گلدستہ جوش شرر آوے
غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانہ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

ظ

ظلمت کدہ،ظلمت گستری:

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

ع

عرق ریز تپش،عزلت آباد صدف، عجز آباد، عجز اختیار،عناں گیر،عنقا ارمی،عید نظارہ، عصائے خضر،عقدہ پیرائی:

اسد تار نفس ہے ناگزیر عقدہ پیرائی
بنوک ناخن تدبیر کیجیے حل مشکل ہا
عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
ہوئی ہیں آب شرم کوشش بے جا سے تدبیریں
عرق ریز تپش ہیں موج کے مانند زنجیریں
ہے وطن سے باہر اہل دل کی قدرو منزلت
عزلت آباد صدف میں قیمت گوہر نہیں
وہ پردہ نشیں اور اسد آئینہ اظہار
شہرت چمن فتنہ وعنقا ارمی ہے

غ

غبار خاطر آزردگاں، غبار راہ ویرانی، غلطی ہائے مضامیں، غفلت آرامی، غم آرائی ، غوغائے جرس، غلطانی تپش:

حیرت ہجوم لذت غلطانی تپش
سیماب بالش و کمر دل ہے آئنہ
نہیں ہے ضبط جز مشاطگی ہائے غم آرائی
کہ سیل سرمہ چشم داغ میں ہے آہ خاموشاں
رنجش دل اک جہاں ویراں کرے گی اے فلک
دشت ساماں ہے غبار خاطر آزردگاں
سر بہ زانوئے کرم رکھتی ہے شرم ناکسی
اے اسد بے جا نہیں ہے غفلت آرامی تری
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

ف

فال رسوائی، فتراک بے خودی، فرسودن پائے طلب، فسردہ تمکیں، فرصت گداز، فتادہ خاطر، فشار صحرا، فراز گاہ عبرت:

ناسازی نصیب درشتی غم سے ہے
صہبا فتادہ خاطر و مینا شکستہ دل
بفراز گاہ عبرت چہ بہار و کو تماشا
کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی
یک گام بے خودی سے لوٹیں بہار صحرا

آغوش نقش پا میں کیجیے فشار صحرا
جنوں فسردہ تمکیں ہے کاش عہد وفا
گداز حوصلہ کو پاس آبرو جانے
ہر گرد باد حلقہ فتراک بے خودی
مجنون دشت عشق تحیر شکار ہے

ق

قطرہ زن قفس رنگ، قفس رنگ و بو، قفل زر، قفل زنگ آلودہ، قسط عمر، قہرمان عشق، قمار خانۂ عشق:

ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
بہ کسوت عرق شرم قطرہ زن ہے خیال
مباد حوصلہ معذور جستجو جانے
واں پرفشان دام نظر ہوں جہاں اسد
صبح بہار بھی قفس رنگ و بو نہ ہو
قمری کف خاکستر وبلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے
ہوئی یہ بے خودی چشم وزباں کو تیرے جلوے سے
کہ طوطی قفل زنگ آلودہ ہے آئینہ خانے میں

ک

کاروان حیرت، کف موجہ حیا، کف تغافل، کشور گفت وشنود، کف گوہر بار، کلفت کشی

ہستی، کنگر استغنا، کمیں خانہ، کعبہ ایجاد یقیں، کشادہ رخ (بے پردہ)، کدورت کش، کتاب طرب نصاب:

اس کتاب طرب نصاب نے جب
آب و تاب انطباع کی پائی
مظہر فیض خدا جان ودل ختم رسل
قبلہ آل نبی کعبہ ایجاد یقیں
جوش طوفان کرم ساقی کوثر ساغر
نہ فلک آئنہ ایجاد کف گوہر بار
واں کنگر استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے
کف موجہ حیا ہوں بگزار عرض مطلب
کہ سرشک قطرہ زن ہے بہ پیام دل رسانی
دل دے کف تغافل ابروے یارمیں
آئینہ ایسے طاق پہ گم کر کہ تو نہ ہو

گ

گنج شرر، گرم خیال، گزرگاہ خیال، گریوہ غم، گریبان شق خامہ، گرمی نشاط، گل نغمہ، گلدستہ نگاہ، گلبازی اندیشہ، گلبانگ تسلی، گلگوں نکہت گلدستہ، خار، گردش رنگ چمن، گنجینہ معنی کا طلسم:

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے
وحشت نے لارکھا تری بزم خیال میں
گلدستہ نگاہ سویدا کہیں جسے

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

عمر میری ہوگئی صرف بہار حسن یار
گردش رنگ چمن ہے ماہ و سال عندلیب

گریہ ہائے بے دلاں گنج شرر در آستیں
قہرمان عشق میں حسرت سے لیتے ہیں خراج

ل

لباس عریانی، لب افسوس، لب ریز آمیں، لذت آزار، لطف گستر:

بہر پروردن سراسر لطف گستر سایہ ہے
پنجہ مژگاں بہ طفل اشک دست دایہ ہے

غم وعشرت قدم بوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
دعائے مدعا گم کردگاں لبریزِ آمیں ہے

قبائے جلوہ فزا ہے لباسِ عریانی
بطرزِ گل رگِ گل مجھ کو تارِ داماں ہے

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجیے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

حاصل الفت نہ دیکھا جز شکست آرزو
دل بدل پیوستہ گویا یک لب افسوس تھا

م

متاعِ خانۂ زنجیر، متاعِ جلوہ، مجموعۂ پریشانی، محشرِ خیال، محشرستان، محمل نشین راز، محمل

کش، مزدورِ سنگیں دست، مژگانِ باز ماندہ، مژدۂ خوابناک، مژگانِ تماشا، مژگانِ چشم دام، مساسِ دستِ افسوس، مسیح کشتۂ الفت، موج خمیازہ، موج نگہ، میزان طبیعت:

میں جو گردوں کو بمیزان طبیعت تولا!
تھا یہ کم وزن کہ ہم سنگِ کفِ خاک چڑھا

بنالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

جوشِ تکلیفِ تماشا محشرستانِ نگاہ
فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشتِ آب تھا

بسکہ ہیں صیاد راہ عشق میں محو کہیں
جادۂ رہ سر بسر مژگان چشم دام ہے

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جنبش دل سے ہوئے ہیں عقد ہائے کاروا
کمتریں مزدور سنگیں دست ہے فرہاد یاں

یک بیاباں تپش بال شرر سے صحرا
مغز کہسار میں کرتا ہے فرو نشتر خار

ن

ناقوسی، ناگیرائی، نالہ محشر عناں، نبض حسن، نزاع جلوہ، نسخہ ادوار ظہور، نشہ وحشت، نشہ ایجاد، نشتر زار، نشاط آہنگ، نظرگاہ حیا، نفس آرمیدہ، نفس نارسا، نغمہ ہائے غم، نقش ونگار طاق نسیاں، نعل واژوں، نقص آباد ہستی، نم دامان عصیاں، نوا ساز فغاں، نو بہار ناز، نور چشم وحشت، نیرنگ خیال، نیازستان، نیرنگ نظر، نور العین دامن، نیرنگ سواد، نیم رنگی، نرگستان، نیستان شیر قالی:

بوقت کعبہ جوئی ہا جرس کرتا ہے ناقوسی

کہ صحرا فصل گل میں رشک ہے بتخانہ چیں کا

نفس حیرت پرست طرز ناگیرای مژگاں

مگر یک دست و دامان نگاہ واپسیں پایا

وہ جہاں مسند نشین بارگاہ ناز ہو

قامت خوباں ہو محراب نیازستان عجز

کاوش دزد حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے

ناخن انگشت خوباں نعل واژوں ہے مجھے

غرور لطف ساقی نشہ بے باکی مستاں

نم دامان عصیاں ہے طراوت موج کوثر کی

تیرا پیمانہ مے نسخہ ادوار ظہور

تیرا نقش قدم آئینہ شان اظہار

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے

داغ دل بے درد نظر گاہ حیا ہے

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہوگئیں

و

وادی خیال، واماندۂ ذوقِ طرب، ورق گردانده، ورق ناخوانده، وحشت آباد، وحشت رقمی، وہم تماشا:

سازِ وحشت رقمی ہا کہ باظہار اسد

دشت وریگ آئینہ، صفحۂ افشاں زدہ ہے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال

تا بازگشتِ سے نہ رہے مدعا مجھے

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے

ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ

ورنہ ہے چرخ و زمیں یکِ ورق گردانده

نظربازی طلسمِ وحشت آبادِ پرستاں ہے

رہا بیگانۂ تاثیر افسوس آشنائی کا

ہ

ہرزہ درا، ہوادار، (بمعنی ہواخواہ)، ہرزہ روی، ہیچ کسی، ہیولاے مداد:

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے

رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

اسد! اے ہرزہ درا نالہ بہ غوغا تاچند

حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

بساطِ ہیچ کسی میں برنگِ ریگ رواں

ہزار دل بہ وداعِ قرار رکھتے ہیں

اے ہر زہ روی منتِ تمکینِ جنوں کھینچ

تا آبلہ محمل کش موج گہر آوے

باقلیم سخن ہے جلوۂ گردِ سواد آتش

کہ ہے دودِ چراغاں سے ہیولاے مداد آتش

ی

یک بیاباں ماندگی، یک چمنستان، یک جہاں، یک عالم، یک دستہ شرار، یوسفستاں:

تکلف برطرف ذوق زلیخا جمع کر ورنہ
پریشاں خواب آغوش وداع یوسفستاں ہے

مژہ خواب سے کرتا ہوں باآسایش درد
بخیہ زخم دل چاک بیک دستہ شرار

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حساب موجہ رفتار ہے نقش قدم میرا

اے خوشا وقتے کہ ساقی یک چمنستاں وا کرے
تارو پود فرش محفل پنبہ مینا کرے

یہ غالب کی لفظی اختراعات اور جدت تراکیب کے کچھ نمونے تھے جو جستہ جستہ مثالوں کے ساتھ پیش کیے گئے۔ یہاں ان کا پورا احاطہ ممکن نہ تھا جس کے لیے دیوان کا جزو اعظم یہیں نقل کر دینا پڑتا۔ کسی اور شاعر نے لفظی جدتوں سے اتنا کام نہ لیا ہوگا۔

فارسیت

نئی تراکیب اضافی کے علاوہ جو لازماً فارسی میں ہیں، کچھ بندھے بندھائے فارسی محاورے بھی بلا تکلف استعمال کیے ہیں: برہم زدن، برہم خوردن، زبونی کش وغیرہ وغیرہ، یا ان کے ہندی ترجمے: سر کھینچنا (سرکشیدن)، منت کھینچنا، خجالت کھینچنا، انتظار کھینچنا، ناز کھینچنا جو بعض جگہ کھٹکنے لگتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

تکلف بر طرف، ذوق زلیخا جمع کر، ورنہ
پریشاں خواب آغوش وداع یوسفستاں ہے

یہاں ''ذوق بہم آوردن'' کی پیروی میں ''ذوق جمع'' عجیب لگتا ہے۔ وہ تو ''چلو'' کی جگہ بھی ''مشت آب'' لکھتے ہیں اور اردو کے عام محاورے سلائی پھیرنا کی جگہ ''سلائی کھینچنا'' جان

سے ہاتھ دھونا کی جگہ ''دست از جاں شستن'':

رہا نظارہ وقت بے نقابی آب پر لرزاں
سرشک آگیں مژہ سے دست از جاں شستہ بردر تھا

کلام میں فارسی مصادر بھی مشتقات کے علاوہ، اپنی اصل مصدری شکل میں جا بجا درج ہوئے ہیں۔ ان ۴۸ مصادر کے علاوہ جو ''قادرنامہ'' میں مع اردو مترادفات درج ہوئے، ۵۶ مصادر اور ہیں جو اشعار میں جوں کے توں پروئے گئے ہیں۔ کل فہرست یہ ہے:

افراختن، افروختن، افسردن، افشردن، انداختن، اندوختن، آرامیدن، آرمیدن، برآمدن، آموختن، آوردن

باختن، بالیدن، باریدن، برخاستن، برچیدن، برانداختن، بخشیدن، برہم زدن، بسر کردن، بریدن، بیدار بودن

تاختن، تپیدن، ترسیدن،

جستن، جنگیدن، جوشیدن،

چکیدن، چیدن

خستن، خفتن، خوردن، خواستن، خمیدن

دادن، داشتن، دردن، دریدن، دمیدن، دریافتن، دزدیدن، دوختن، دویدن، دیدن

رسانیدن، رسیدن، رستن، رفتن، رمیدن، رشتن، رنجیدن، رویاندن

زدن، زدودن، زیستن

ساختن، سختن، سوختن، سرودن، سنجیدن

شدن، شکستن، شگفتن، شنیدن

غنودن

فرسودن، فسردن، فروختن، فہمیدن

کاستن، کاشتن، کردن، کشادن، کشتن، کشیدن

گزشتن، گستردن، گستن، گردیدن، گفتن، گشن

لرزیدن، لیسیدن

ماندن، مردن

نشستن، نوشیدن

واشدن، ورزیدن

ہراسیدن

یافتن

ٹھیٹھ فارسی کے ساتھ ٹھیٹھ اردو محاورے بھی ضرور باندھے ہیں جیسے سانٹھ ملنا، سر کھانا، کنیانا۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ فارسی مصادر کے مقابلے میں اردو کے مصادر (خالص افعال بلا مشتقات و مرکبات) نسبتاً کم ہیں۔

تصرفات و تسامحات

جدتوں کے ضمن میں کچھ تصرفات کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے اور کچھ معنوی تسامحات کا بھی، یا ان کی اپنی اصطلاح میں ''غلطی ہائے مضامین'' کا۔ پہلے انھی کو لیجیے۔

حشو و زوائد کی چند مثالیں:

''آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے''۔

دیگر:

''عینک چشم بنا روزن زنداں مجھ کو''۔

دیگر:

''ہے عرق افشاں مشی سے ادہم مشکین یار''۔

ادہم مشکی گھوڑے ہی کو کہتے ہیں۔ مشی کے معنی ٹہلنا۔ محبوب کی نزاکت تو مسلم ہے۔ لیکن اس کا

گھوڑا کتنا نازک ہوگا کہ صرف پوقدمی چال سے عرق عرق ہو گیا۔

دیگر:

''مژہ ہے ریشہ رزانگور''۔

رزانگور کی بیل کا نام ہے۔ بعض لغات نے اس کے معنی محض انگور بھی دیے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ''زرانگور'' حشو ہے۔

دیگر:

''سیل یاں کوک صدائے آبشار نغمہ ہے''۔

معلوم نہیں مرزا صاحب نے کوک کے کیا معنی لیے۔ فارسی میں تو اس کا کوئی جواز نہیں۔ ہندی میں کوک چیخ یا تیز پتلی آواز کو کہتے ہیں، جیسے کویل کی کوک۔

دیگر:

''حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے''۔

سزا کے ساتھ عقوبت صریحاً حشو ہے۔

دیگر:

''لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں بے تابیاں''۔

لے محض زائد ہے۔

غلطی ہائے مضامین کے کچھ اور نمونے:

تجھ کو اے غفلت نسب پروائے مشتاقاں کہاں''۔

معلوم نہیں غفلت کو نسب سے کیا تعلق ہے۔

اسی طرح آفت سے بھی بظاہر نسب کی کوئی مناسبت نہیں:

''ہنوز آفت نسب یک خندہ یعنی چاک باقی ہے۔''

دیگر:

''ہوں بقدر عدد حرف علی سبحہ شمار''۔

علی اسم علم ہے، جسے حرف نہیں کر سکتے ،البتہ اس میں تین ''حروف'' ہیں جن کی مجموعی
قیمت ارزوئے جمل ۱۱۰ ہوتی ہے۔حرف کے دوسرے معنی حکایت ہیں،وہ بھی یہاں نہیں لگتے۔

قواعد سے انحراف بھی ملتا ہے۔مثلاً:

''کمال حسن اگر موقوف انداز تغافل ہو''۔

فارسی کے قاعدے سے دیکھیے یا ہندی کے قاعدے سے موقوف کے ساتھ بر یا پر آنا
چاہیے۔

ولہ ''حباب مے بصد بالیدنی ساغر نہیں ہوتا''۔

یہاں بھی ''بالیدنی'' نہ اردو میں چست بیٹھتا ہے نہ فارسی میں۔ بظاہر ''بالیدن'' کی
جگہ بالیدنی لکھ گئے ہیں۔

ولہ ''غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے''۔

اپنی کی جگہ ''مری'' کھٹکتا ہے۔

''اسے یوسف کے بوے پیرہن کی آزمائش ہے۔''

آزمائش کے بعد منظور ہے یا مقصود ہے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ولہ ''ہمیں دماغ کہاں حسن
کے تقاضا کا''۔

تقاضا میں امالہ چاہیے۔

ولہ ''طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ۔''

قواعد کی رو سے ''کو'' کی جگہ طوطی کے مقابل چاہیے تھا۔

دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہے اعضا نمک

''مانگیں ہیں'' کا موقع تھا۔مگر اس طرح ایک کی جگہ دو حرف دیتے ہیں۔

ولہ ''وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو''۔

یہاں کیوں اور نہ دونوں کے بغیر بات پوری ہوجاتی ہے لیکن ''نہ'' تو صریحاً خلاف
محاورہ ہے۔

ولہ ''مصراع نالہ نے سکتہ ہزار جا ہے''۔

مصراع القط ہے یا مصرع میں سکتہ ہے۔

ولہ ''غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو''۔ (کی حذف ہے)۔ولہ ''ہم کو تقلید تنگ ظرفی
منصور نہیں''۔)

ذیل کے مصرعوں میں تلفظ قابل توجہ ہے:

ع ''وضع میں اس کو اگر سمجھیے قاف تریاق''
ء بغرور طرح وقامت و رعنای سرو
ء طوق ہے گردن قمری میں رگ بالیدہ
ء ہے خامہ فیض بیعت بیدل بکف اسد
ء یک نیستاں قلم رو اعجاز ہے مجھے

نام گل کا پھول، شبنم اوس ہے
جس کو نقارہ کہیں وہ کوس ہے
جس کو کہتے ہیں جمای فازہ ہے
جو ہے انگڑائی وہی خمیازہ ہے

جماہی صحیح لفظ ہے۔تذکیر و تانیث کے معاملے میں بھی آزادہ روی سے کام لیا ہے۔یہ
بھی شاید فارسی کے غلبے کا اثر ہے۔جہاں فارسی میں مذکر و مونث کی تخصیص نہ ہو وہاں اردو میں بھی
کیوں ہو۔غالب کے ہاں حسب ذیل الفاظ مذکر ہیں:

مژہ،راہ گزر،گرہ

اور حسب ذیل مونث۔دونوں صورتوں میں عام روش سے انحراف ہے:

التماس،سخن،گل گیر،چمن زار،آہنگ،صور،ایما۔لکھتے ہیں:

''چمن زار تمنا ہوگئی صرف خزاں، لیکن
بہار نیم رنگ آہ حسرت ناک باقی ہے''

ممکن ہے کتابت میں ہو گئے کی جگہ ہوگئی بن گیا ہو لیکن ذیل کے مصرع میں ''ہنوز یک سخن بے صدا نکلتی ہے''۔

سخن کو مونث ہی ماننا پڑے گا جو روش عام کے خلاف ہے۔ بعض حروف بری طرح دبتے ہیں:

بے نوائی   تر صدائے نغمہ شہرت اسد
بوریا یک نیستاں عالم بلند دروازہ تھا
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے اسے بالیں پہ مری پر کس وقت

تنافر کی مثالیں:

غلطی   کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

کاف کی تکرار سے مصرع خاصا کرکرا ہو گیا ہے

ذکر میرا   بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

یہاں بھی ب کی بہتات سے بھدا پن پیدا ہوا ہے۔

ولہ   تنگ بالیدن ہیں جوں موئے سر دیوانہ ہم

یہاں ''موے سر'' کے ساتھ ''جوں'' نے عجیب طرح کا ذم پیدا کیا ہے، سر بھی جنونی کا! عجب نہیں کہ یہ تلازمہ جان کر پیدا کیا گیا ہو کیوں کہ غالب رعایت لفظی سے کام لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں دیتے۔ لیکن یہ بھی کمال ہے کہ ان کے ہاں رعایت لفظی کھٹکنے نہیں پاتی۔ عام طور پر مضمون کی تابع رہتی ہے شعر پر حاوی نہیں ہوتی۔ متداول دیوان کی پہلی ہی غزل کا کوئی شعر رعایت سے خالی نہیں اگر چہ اس کی بابت عام تاثر یہ نہ ہوگا جیسے کہ اب تک لوگ اس بات پر چونکتے ہیں کہ جو لفظ انھوں نے سب سے زیادہ برتا ہے وہ آئینہ ہے اس کے بعد حیرت، تحیر، مژہ، حنا وغیرہ کی بھی خاصی بہتات ہے۔

غالب کے کلام میں بعض تضادات بہت نمایاں ہیں۔ تنافر کی چند مثالیں اوپر گزریں،

لیکن ان کا منتخب کلام شستگی و خوش آہنگی میں آپ اپنی مثال ہے۔ اسی طرح مغلق اور مبہم اشعار کے ساتھ جو محض لفظی گورکھ دھندے ہیں، صاف اور سجل اشعار کی بھی کمی نہیں، سہل ممتنع تک برت کر دکھا دیا ہے۔ بہت سے اشعار میں معنی تہ در تہ ہیں جنھیں قارئین اور شارحین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق سمجھا ہے۔ میں نے کوئی سو اشعار کی جداگانہ تشریح کی ہے جو متفرق مضامین کی شکل میں چھپتی رہی ہے۔

جہاں تک متداول دیوان سے خارج کردہ کلام کا تعلق ہے۔ اس پر جو اعتراض وارد ہوں، ان سے غالب یہ کہہ کر پیچھا چھڑا سکتے ہیں کہ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ یہ کلام میرا نہ سمجھا جائے (''از طراوش کلک ایں نامہ سیاہ نہ شمارند'') اگر چہ یہ سب اعتراض مسترد کلام سے تعلق نہیں رکھتے۔ دراصل وہ کلام جو غالب نے نہیں بلکہ ان کے بعض کرم فرماؤں نے قلم زدنی قرار دیا، اپنی جگہ نفسیاتی اور ادبی دونوں طرح کے مطالعے کے لیے بڑا دلچسپ میدان ہے اور اس میں سے بعض ایسے نوادر نکل آتے ہیں کہ ہرگز گم کرنے کے قابل نہ تھے۔

''تضادات'' کے سلسلے میں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ اگر چہ ان کے عنفوان شباب کا اکثر کلام گنجلک سمجھ کر خارج کرایا گیا تھا، پھر بھی بیشتر کلام جس پر غالب کی شہرت و عظمت کا دارومدار ہے، اسی عنفوان شباب سے تعلق رکھتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ۱۸،۱۹ سال کا ایک نوخیز لڑکا کیسی دلفریب، سحر انگیز شاعری کرتا تھا جو خیال کی گہرائی اور پختگی کے لحاظ سے بھی فکر انگیز اور حیرت خیز ہے۔ خود شاعری کے بارے میں اس نے کیسی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں:

خواہش دل ہے زباں کو سبب گفت و بیاں
ہے سخن گرد ز دامان ضمیر افشاندہ
ولہ کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ

جناب کالی داس گپتا رضا کے مطابق یہ بیس سال سے کم عمر کا کلام ہے۔ حیرت ہے کہ وہ ۱۹ سال کی عمر میں خود کو بوڑھا سمجھنے لگے تھے:

اسد کی طرح میری بھی بغیر از صبحِ رخساراں
ہوئی شام جوانی اے دل حسرت نصیب آخر
(۱۸۱۶ء)

ساز ایمائے فنا ہے عالم پیری اسد
قامت خم سے ہے حاصل شوخی ابرو مجھے
(۱۸۱۶ء)

کیا واقعی ۱۸ سال کی عمر میں ان کی کمر جھک گئی تھی، یا یوں ہے کہ شاعر اور شاعری کی عمر تقویم سے ماورا ہوتی ہے۔ غالب نے اپنے بارے میں کہا تھا:

میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

اتفاق سے اس سلسلے میں ان کا وہی کلام زیادہ معتبر ٹھہرتا ہے جو ان کی زندگی میں دیوان سے خارج کرا دیا گیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل دلچسپ ہوگی:

دورِ جدید میں، یعنی پچھلے کوئی دو سو سال سے انسانی ذہن دو متضاد فکری رجحانات کی زد میں رہا ہے۔ ایک میں فرد کی آزادی پر زور ہے۔ اسے روسو سے منسوب کر سکتے ہیں دوسرے کو چاہیں تو روس سے۔ ان دونوں فکری رویوں کا تخلیقی نفسیات کی تشکیل میں بڑا دخل رہا ہے۔

روسو نے سماجی انصاف کی بابت جو تصورات پیش کیے ان میں فرد کی آزادی پر خاص طور سے زور تھا۔ اس طرزِ فکر نے ادب اور آرٹ پر گہرا اثر ڈالا جہاں تخلیقی جینیس کی فطری انانیت کے سبب اس کی قبولیت کے لیے فضا زیادہ سازگار تھی۔ یورپ میں اس رجحان کو فرانسیسی شاعر رمباں نے مستحکم کیا۔ اس کے اور غالب کے درمیان بعض باتیں حیرت انگیز طور پر مشترک ہیں:

دونوں عنفوانِ شباب ہی میں اپنی شاعری کی معراج پر پہنچ گئے تھے۔ رمباں تو ۱۹ سال کی عمر تک سب کچھ لکھ کر گویا قلم توڑ بیٹھا۔ شاعری ترک کر دی۔ غالب کا بیشتر منتخب کلام بھی ان کی عمر کے اسی دورِ برنائی سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۸۱۶ء یعنی ۱۹ سال کی عمر تک وہ جو کچھ لکھ چکے تھے اس پر آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ ۱۸۲۱ء کے بعد تو اور بھی کم لکھا۔ رمباں کا کہنا تھا کہ میں اپنے خیالات

کے باؤلے پن کو مقدس سمجھتا ہوں جو میرے اندر سے برآمد ہوئے ہیں۔ غالب بھی یہی کہتے تھے کہ "گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"۔ دراصل جدید آرٹ یا جدید شاعری آپ سے داد نہیں طلب کرتی۔ کوئی بات آپ کے اندر کہیں ٹن سے جا کر لگتی ہے تو خیر، نہیں لگتی تو نہ سہی۔ شاید کوئی دوسرا قدرداں نکل آئے۔ دورِ جدید کا شاعر اپنے نفس کی تسکین کے لیے لکھتا ہے۔ وہ دوسرا مکتبہ فکر ہے جس نے شاعری کو سماجی انقلاب بنایا۔ شاعر کو مفید کام سے لگایا۔ بہت سے معصوم ذہن سماجی انصاف کے اس دوسرے نظامِ فکر کے سحر میں آئے، خصوصاً نوجوان ذہین طبقے کے لیے اس میں بڑی پرزور کشش تھی۔

جدید علم النفس نے بھی ذہنوں کو چونکایا۔ لاشعور کے تخلیقی عمل کو سمجھنے اور تخلیقی کیمیا کا نسخہ پانے کی جستجو شروع ہوئی۔ لاشعور کو آزاد چھوڑ کر آس لگائی گئی کہ دیکھیں اس گہرے کنویں سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ بہت سی جدید شاعری اسی تجربے کی پیداوار ہے۔

دوسرے مباحث سے قطعِ نظر، یہاں یہ نکتہ لائقِ توجہ ہے کہ غالب جو رمباں سے نصف صدی پیشتر پیدا ہوئے، دراصل نہ صرف اردو بلکہ تمام جدید شاعری کے پیشرو تھے۔ یہاں اس سے غرض نہیں کہ روسو کے افکار ان تک رسائی حاصل کر سکے تھے یا نہیں۔ روحِ عصر بڑے پراسرار طریقے سے اپنا اثر دکھاتی ہے۔

ہماری جدید شاعری میں بھی وہی آزادانہ روش کا رونا ہے جس کی طرح غالب نے ڈالی تھی بلکہ وزن اور قافلے کی اثر آفرینی سے دست بردار ہو کر اس نے اپنا کام اور بھی مشکل بنا لیا ہے۔

(ششماہی غالب، ادارہ یادگار غالب کراچی، شمارہ ۱۹، ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۲-۱۹۰)

ڈاکٹر مختار الدین احمد

غالب کی ایک کم یاب تصنیف ''تیغِ تیز''

انقلاب سنہ ستاون میں مرزا غالب کے پاس محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی فارسی لغت ''بُرہانِ قاطع'' کا ایک چھاپے کا نسخہ تھا جس کا وہ وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ دورانِ مطالعہ انھیں انداز ہوا کہ اس میں خاصے اغلاط و اوہام ہیں۔ وہ کتاب کے حاشیے پر اشارات ثبت کرتے رہے اور اعتراضات لکھتے رہے۔ جب کتاب ختم ہوئی تو ایک اچھے خاصے رسالے کا مواد فراہم ہو گیا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور عام فارسی دانوں کے فائدے کی خاطر ان اعتراضات کو رسالے کی شکل دے دی اور اس کا نام ''قاطعِ بُرہان'' رکھ دیا۔

غالب ایک خط میں صاحبِ عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

> اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی ''بُرہانِ قاطع'' میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزار لغت غلط، ہزار ہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارت پادر ہوا۔ میں نے سودوسو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور ''قاطعِ بُرہان'' اس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدور نہ تھا۔ مسوّدہ کاتب سے صاف کروالیا ہے۔ اگر کہو تو بہ سبیلِ مستعار بھیج دوں۔ تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں، اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔

یہ کتاب اگرچہ ۱۸۶۰ء میں مرتّب ہوگئی تھی، لیکن اس کی اشاعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ آخر منشی نول کشور کی توجّہ و مہربانی سے ۱۸۶۲ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ میرزا لکھتے ہیں:

> اگر ایں جواں مردِ بیدار دل بہ بستنِ شیرازۂ اوراقِ پریشاں نہ پرداختے، کاغذِ مسودات ''قاطعِ بُرہان'' را یا کاغذ گر بُردے و بہ آب آغشتہ فرو کوفتے، یا سُرمہ فروش خریدے تا چکسہ ہا ساختے۔

کتاب کا چھپنا تھا کہ مؤلف ''قاطعِ بُرہان'' اور دوسرے فارسی دانوں کے متعلق غالب کی تنقید و استہزا پر ایسا سخت ہنگامہ کھڑا ہوا کہ بقولِ غلام رسول مہر غالب کو تادمِ زیست اس سے نجات نہیں ملی۔ خود غالب اس ہنگامۂ دارو گیر کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> معتقدانِ ''قاطعِ بُرہان'' برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ''قاطعِ بُرہان'' غلط ہے، یعنی ترکیب خلافِ قاعدہ ہے۔ بُرہان ''قاطع'' نہیں ہوسکتی۔ لو صاحب، ''بُرہانِ قاطع'' صحیح اور ''قاطعِ بُرہان'' غلط۔ ''قاطعِ بُرہان'' میں جو ''بُرہان'' کا لفظ ہے۔ مختلف ''بُرہان قاطع'' ہے۔ ''بُرہانِ قاطع'' کے رد کو قطع سمجھ کر ''قاطع بُرہان'' نام رکھا تو کیا گناہ ہوا!

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> ''قاطعِ بُرہان'' کا لکھنا کیا ہے گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا ہے۔ سہامِ ملامت کا ہدف ہوا کہ یہ تنک مایہ معارضِ اکابرِ سلف ہوا۔

غالب کی ''قاطعِ بُرہان'' کے رد میں کتابیں لکھی جانے لگیں مولوی سید سعادت علی نے ''محرقِ قاطع'' (شاہدرہ، دہلی، ۱۸۶۴ء)، مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد مرزا رحیم بیگ نے ''ساطعِ بُرہان'' (مطبعِ ہاشمی، میرٹھ، ۱۳۸۲ھ)، مولوی امین الدین پٹیالوی نے ''قاطع القاطع'' (مطبعِ مصطفائی، ۱۲۸۳ھ/ اور آغا احمد علی اصفہانی ثم جہاں گیر نگری نے ''مؤیّدِ بُرہان'' (کلکتہ، ۱۸۶۶ء) تصنیف کر کے شائع کی۔ غالب اور ان کے دوستوں نے جواب میں حسبِ ذیل پانچ رسالے لکھے:

''دافعِ ہذیان'' از مولوی نجف علی جھجھری

''لطائفِ غیبی'' از منشی میاں داد خان سیّاح

''سوالاتِ عبدالکریم'' از عبدالکریم

نامۂ غالب'' از مرزا غالب

''تیغِ تیز'' از مرزا غالب

ان رسالوں میں، جو غالب کی حمایت میں لکھے گئے، ''دافعِ ہذیان'' (اکمل المطابع، دہلی، ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) مولوی نجف علی خاں جھجھری (متوفّی ۱۲۹۸ھ) کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ فارسی و عربی کے عالم تھے اور دساتیر سے واقف تھے۔ انھوں نے دساتیر کی فرہنگ لکھی ہے جس پر غالب کی تقریظ ہے۔ یہ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی۔ ان کی تصانیف میں پچیس تیس کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ غالب منشی حبیب اللہ خان ذکا حیدر آبادی کو ایک خط (مؤرخہ: ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء) میں لکھتے ہیں:

اہاہا! ''محرقِ قاطع'' کا تمھارے پاس پہنچنا:

کامے کہ خواستم ز خدا شد میسرم

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا، مگر ہاں، سخن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا۔ ایک صاحب نے فارسی میں اس کے عیوب ظاہر کیے، دو طالب علموں نے دو رسالے جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو، ''محرق'' کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق ''دافعِ ہذیان'' و ''سوالاتِ عبدالکریم'' اور ''لطائفِ غیبی'' کو پڑھ کر متنبہ نہ ہو اور ''محرق'' کو دھونہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔ ''دافعِ ہذیان''، ''سوالات''، ''لطائفِ غیبی''، تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ یقیں ہے کہ بہ تقدیم و تاخیرِ یک دو روز نظرِ انور سے گزریں۔

انھی کو لکھتے ہیں:

مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں، صرف اتحادِ معنوی کے اقتضا سے ''دافعِ ہذیان'' لکھ کر انھوں نے فنِ سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔

معرکۂ ''قاطعِ بُرہان'' کی بقیہ چار کتابیں قرینِ غالب ہے کہ میرزا کی لکھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے ''لطائفِ غیبی'' میاں داد خان سیّاح اور ''سوالاتِ عبدالکریم'' ایک طالبِ علم عبدالکریم کے نام سے شائع کرائیں۔ دو رسالے ''نامۂ غالب'' اور ''تیغِ تیز'' خود غالب نے لکھے اور اپنے نام سے شائع کیے۔ پہلے رسالے کے مخاطب میرزا رحیم بیگ مؤلفِ ''ساطعِ بُرہان'' ہیں اور دوسرے کے آغا احمد علی اصفہانی۔ یہاں اسی مؤخرالذکر کتاب کے بارے میں کچھ معروضات پیش کیے جاتے ہیں۔

''تیغِ تیز'' ۳۲ صفحوں کا ایک مختصر اردو رسالہ ہے جو اکمل المطابع، دہلی میں بہ اہتمامِ فخر الدین ۱۸۶۷ء میں طبع ہوا۔ یہ، جیسا کہ اوپر گزرا، آغا احمد علی کی کتاب ''مؤیدِ بُرہان'' کے رد میں ہے۔ اس میں ایک تمہید، سترہ فصلیں ہیں اور ایک خاتمہ آخر میں ہے۔ پہلی سولہ فصلوں میں ایک ایک اعتراض آغا احمد علی پر ہے اور اس کے ساتھ ان کے اعتراض کا جواب بھی دیا ہے۔ آخری فصل میں ''بُرہانِ قاطع'' پر مزید اعتراضات ہیں۔ رسالے کے آخر میں سولہ سوالات کا استفتا ہے، جن کے جواب نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے دیے ہیں۔ جوابات کی تصدیق مولانا الطاف حسین حالی، مولوی محمد سعادت علی خان مدرس گورنمنٹ اسکول دہلی اور نواب ضیاء الدین احمد رخشاں دہلوی نے کی ہے۔

''تیغِ تیز'' کی تمہید خاصی دل چسپ ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

ظلم کی انواع میں، ازاں جملہ ایک سخن پروری ہے کہ اس کو بے ایمانی کہنا چاہیے۔ یعنی کتمانِ حق اور اعلانِ باطل بہ اصرار! اسداللہ خان غالب کہتا ہے کہ میں نے خاص نظر بہ اعلانِ حق ''بُرہانِ قاطع'' کی عبارت کی سستی اور بیان کی غلطی اور اطنابِ ممل کی نکوہش میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام ''قاطعِ بُرہان اور درفشِ کاویانی'' رکھا۔

اس کے بعد ان کی ''قاطعِ بُرہان'' کے رد میں جن معاصرین نے مخالفانہ کتابیں لکھی تھیں، ان کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلے وہ ''محرقِ قاطع'' کے مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں:

ایک مردِ بے مغز، معوّج الذہن، نہ فارسی دان، نہ عربی خوان، نے میری نگارش کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی۔ ''محرقِ قاطع'' اس کا نام رکھا اور اس کو مشتہر کیا۔ میرے ایک یار نے اس کتاب کے جواب میں کچھ لطائف جمع کیے اور ''لطائفِ غیبی'' اس کا نام رکھا۔ وہ نسخہ بھی مشہور ہوا۔

وہ مؤلفِ ''ساطعِ بُرہان'' مرزا رحیم بیگ کے متعلق لکھتے ہیں:

ایک مرزا رحیم بیگ، میرٹھ کے رہنے والے، بروے کار آئے اور ایک تحریر مسمّیٰ بہ ''ساطعِ بُرہان'' نکال لائے۔ مطالبِ مندرجہ لغو، بیشتر ''محرقِ قاطع'' کے مضامین منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا۔ زیادہ اس طرف التفات کرنا تضیعِ اوقات جانا۔

میاں امین الدین مؤلفِ ''قاطعِ القاطع'' کی نسبت فرماتے ہیں:

میاں امین الدین، کہ اب پٹیالے میں ملقب بہ مدرس ہیں، انھوں نے ''قاطع القاطع'' چھپوایا۔ استعدادِ علمی میں سے بعد صَرفِ مقاصدِ نحو وصَرف فارسیت کی اسی قدر رعایت منظور رکھی کہ فقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں، باقی سوائے عربیِ قشری اور فارسیِ مسروقہ کے وہ مغلّظ گالیاں دی ہیں، جو کنجڑے بھٹیارے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کمال یہ کہ ان کا منطق ہندی اور حضرت کی عبارت فارسی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی جُلا ہے اِن دنوں میں علم تحصیل کر کے مہذّب ہو گئے ہیں۔ عمامہ باندھے ہوئے پڑے پھرتے ہیں۔ فحش نہیں بولتے۔ خلاف اپنی قوم کے ''صاحب وقبلۂ'' ان کا روزمرہ ہے۔ یارب، میاں امین الدین کس بُری قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے، مدرس بنے مگر الفاظِ مستعملۂ قوم نہ چھوڑے؟ اگر میری طرف سے ازالۂ حیثیت کی نالش دائر ہو جاتی، تو میاں پر کیسی بنتی، مگر میرے کبرِ نفس نے ازالۂ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔ ان کی تحریر ان کے

پاجی پن پر سجل ہے، بہ مہر ذرّہ تا آفتاب۔

اب آخر میں آغا احمد علی مؤلفِ ''مؤیّدِ بُرہان'' کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

مدرس احمد علی صاحب، عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر، فارسیت میں برابر، فحش و ناسزا گوئی میں کم تر۔ جتنے الفاظ توہین وتذلیل کے ہیں، وہ چن چن کر میرے واسطے صَرف کیے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے، صاحب عزّ وشان ہے، عالی خاندان ہے، امرائے ہند، رؤسائے ہند راجگانِ ہند سب اس کو جانتے ہیں، رئیس زادگانِ سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے، بادشاہ کی سرکار سے ''نجم الدولہ'' خطاب ہے، گورمنٹ کے دفتر میں ''خان صاحب، بسیار مہربانِ دوستاں'' القاب ہے، جس کو گورمنٹ ''خان صاحب'' لکھتی ہے، اُس کو ''سڑی'' اور ''کتا'' اور ''گدھا'' کیوں کر لکھو! فی الحقیقت یہ تذلیل بہ فحوائے ''ضربُ الغلامِ اہانۃ المولیٰ'' گورمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع وشریفِ ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا؟ مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا۔

آخر میں لکھتے ہیں:

میں نے معلم امینِ بے دین کو شیطان کے حوالے کیا، اور احمد علی کے الفاظِ مذموم سے قطعِ نظر کر کے، ان کے مطالبِ علمی کا جواب اپنے ذمّے لیا۔ اِس نگارش کا نام ''تیغِ تیز'' رکھوں گا اور بعدِ اتمام اس کو چھپواؤں گا اور اپنے احبابِ دور و نزدیک کی خدمت میں بھجواؤں گا اور اگر مرگ نے امان نہ دی تو خیر:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب ''تیغِ تیز'' کی سولہ فصلوں میں سے بعض فصلوں کی کچھ باتیں پیش کی جاتی ہیں کہ کتاب کا ایک مجموعی اندازہ ہو جائے۔

فصل: ۱ میں غالب، ''بُرہانِ قاطع'' کے وہ عیوب دکھاتے ہیں جو:

بدیہی ہیں اور حسنِ بصران کا مدرک ہوسکتا ہے۔ سیکڑوں لغت پہلے ''تے'' سے لکھے
ہیں، اور پھر ''طوے'' سے، پہلے حاے حطّی سے لکھے ہیں اور پھر ہاے ہنوز سے،
جو الفاظ واوِ معدولہ سے ہیں، اور جو بے واو ہیں، دونوں کو ایک کر دیا ہے، مثلاً
''خوردہ'' بہ واو جو صیغۂ مفعول ہے ''خوردن'' کا، اور ''خردہ'' بہ خاے مضموم بے واو
جو ترجمہ ہے ''دقیقہ'' کا اور ''نقدی'' کو بھی کہتے ہیں، ان دونوں کا تفرقہ اُٹھا
دیا ہے۔ ''ہف'' بالفتح ایک لفظ ہے ثنائی، اس میں سے ایک سو کئی لغت پیدا کیے
ہیں۔ مزا یہ کہ ''بُرہانِ قاطع'' میں بھی لکھے اور پھر سوادِ ملحقات میں بھی رقم فرمائے۔
مولوی صفحہ ۴۰۲ میں اس لفظ کے باب میں ایک صفحہ پورا سیاہ کرتے ہیں...... ''بسمل''
کے معنی لکھتا ہے، ''ہر چیز کہ آں را ذبح کردہ باشند''۔ میں نے اس مقام پر لکھا ہے
کہ ''ذبح بہرِ جانداراں نہ از برائے اشیا۔'' اب یہاں صاحبانِ فہم و علم و داد سے
انصاف چاہتا ہوں کہ اس بیان میں میں حق پر ہوں یا مؤلّفِ ''بُرہان۔'' جامعِ
''بُرہان'' ''آتش'' کی ''تے'' کو مکسور بتاتا ہے، اور میاں انجو کے قول کو سند لاتا
ہے...... لیکن میں دو بالغ کلاموں [نظامی اور خاقانی] کے کلام کی سند دے کر بلغا اور
کبرا سے پوچھتا ہوں کہ کیوں حضرت، خاقانی اور نظامی سچّے یا انجو ''فرہنگِ جہاں
گیری والا'' اور دکنی ''بُرہانِ قاطع'' والا سچّا۔ وہ دو ایرانی بلند پایہ اور یہ دو ہندی
فرومایہ! جامعِ ''فرہنگ'' سے تعجب ہے کہ فارسی زبان کے مالکوں کے خلاف اپنے
وہم کی رُو سے ''آتش'' بکسرہ لکھتا ہے۔ اہلِ انصاف سے جواب کا طالب
، غالب۔

فصل: ۲

اب مولوی احمد علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ ''مؤیدِ بُرہان'' کے
دوسرے صفحے میں تاکید کرتے ہیں کہ زنہار محمد حسین کو ''دکنی'' نہ کہو، وہ ''تبریزی''

ہے، آخر ظہوری و نظیری بھی ایران سے آکر دکن اور ہند میں رہے ہیں یہ ''دکنی''، وہ
''ہندی'' کیوں نہ کہلائے؟ واہ رے قیاس مع الفارق! ان دونوں میں سے ایک
کا مولد ترشیز، ایک کا مولد نشاپور، بطریقِ سیر و سفر ہند میں آئے، اُن کو ''دکنی'' اور
''ہندی'' کون کہہ سکتا ہے؟ محمد حسین بے چارے کا دادا، پردادا تبریز سے آیا ہوگا، یہ
دکن میں یا ہند کے کسی اور شہر میں پیدا ہوا ہوگا۔ اچھا، مولوی صاحب اگر اس کو
''تبریزی مولد'' کہتے ہیں اور صاحبِ تخلّص تھا تو اس کا دیوان دکھائیں۔ شاہ جہاں
کا عہد تھا۔ محمود غزنوی کے وقت کے شعرا کے کلام جا بجا موجود ہوں، اور شاہ جہاں
کے زمانے کے اشعار نہ پائے جائیں! دیوان نہ سہی، کسی تذکرے میں اس کے کام
کا پتا دیں؟ ہاں، یوں ہوسکتا ہے کہ یہ شخص شعر کہتا ہوگا، مگر پوچ اور واہی، ان اشعار
کی تدوین کیا ہو، اور ان کو تذکرے میں کون لکھے؟ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ''ما قال''
کو دیکھو، ''من قال'' سے قطعِ نظر کرو۔ فقیر پوچھتا ہے کہ ہے کیا، جس کو دیکھیں۔ نظم
مفقود، نثر مردود، نثارانِ عمدہ کا ذکر نہیں کرتا ''منشآت مادھورام'' ''انشاے خلیفہ'' اور
جو چھوٹی چھوٹی نثریں فی الحال تالیف ہوئی ہیں ہر ایک کی عبارت ''بُرہانِ قاطع''
کی طرزِ تحریر سے بہتر ہے۔

فصل: ۴

جناب مولانا ۱۸ صفحے میں حکم دیتے ہیں کہ ''پیدائی'' و ''زیبائی'' صحیح، ''پیدائش''
و ''زیبائش'' غلط۔ اقوال: آخر حاصل بالصدر بنانے کے لیے دو ہی حرف موضوع
ہیں، یا آخر میں شین یا تحتانی! موافق مولوی جی کے اجتہاد کے سیکڑوں لفظ متروک
و مطرود ہو جائیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ ''زیبائش'' اور ''پیدائش''، و ''گنجائش'' کو
''زیبائی'' و ''پیدائی'' و ''گنجائی'' بھی کہہ سکتے ہیں، مگر ''آرایش'' و ''آسایش''
و ''رنجش'' کے آگے بے ترکیب شین کی جگہ یاے حطّی نہیں لا سکتے، اور یہ مقدمہ نہ

دلائل کا محتاج ہے، نہ نظائر کا حاجت مند...... مولوی جی نے قتیل کی پیروی کی ہے کہ وہ غلط غلط محاورے لکھ کر اس کی تصحیح کرتا ہے، مثلاً: نان از مربّاے سیب خوردم'' کو غلط کہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ ''نان با مربّاے سیب خوردم'' کہو۔

فصل:۶

مولوی جی لکھتے ہیں کہ صاحبِ ''فرہنگِ سامانی'' اور خانِ آرزو بھی مانعِ تحصیلِ آب چیں'' ہیں اور عموماً ''رومال'' کو لکھتے ہیں، پھر نتیجہ اس شکل کا یہ نکالتے ہیں کہ یہ اعتراض ان دو شخصوں (سامانی اور خانِ آرزو) کا ہے۔ غالب سارق ہے اس اعتراض کا۔ سبحان اللہ، مضمون کا سرقہ سنا تھا، ''سرقۂ اعتراض'' نہ سنا تھا۔ اتفاقِ رائے کا نام سرقہ رکھنا کتنی بڑی ناانصافی ہے! جامعِ ''بُرہان'' کی رائے کا اور فرہنگ نویسوں کی رائے سے متفق ہونا استناد، اور میری رائے کا سامانی اور آرزو کی رائے سے اتفاق مجھ پر باعثِ الزامِ سرقہ!

غالب اسی فصل میں دال ذال منقوطہ کی بحث میں لکھتے ہیں:

حضرات کو میں اس امرِ خاص میں بہت تکلیف دوں گا اور داد طلبی میں اصرار و ابرام کروں گا۔ فرہنگ ہاے پیش میں کوئی مجھ کو یہ مطلب دکھا دے تو میں گنہگار، ورنہ مولوی اُٹھائی گیرا۔ یہ راز مجھ سے...... ہر مزدثم مولانا واولانا حضرت مولوی عبدالصمد، علیہ الرحمہ نے کہا ہے، دوسرا کوئی اس کو نہیں جانتا تھا، ایسی نئی بات کو چرانا اور اپنا قول بنانا۔ چوری اور سرزوری خیرہ رائی اور بے حیائی ہے یا نہیں؟ مصرع:

اے اہلِ عقل، کوئی تو بولو خدا لگی

فصل:۸

صفحہ ۷۰ میں مولوی مجھ کو ''ابوجہلِ ہندی'' اور دکنی کو ''داناے تبریزی'' لکھتا ہے۔

ہر چند اُس کو میں ''ابولہبِ جہاں گیرنگری'' لکھ سکتا ہوں، لیکن چوں کہ نگارش میں شرط کی ہے کہ مطالب کا جواب دوں گا، فحش و ناسزا کا پاسخ نگار نہ ہوں گا، اس واسطے طرزِ نگارش میں کلام کیا جاتا ہے۔ ''ابوجہلِ ہندی'' اور ''داناے تبریز'' بے جوڑ بات ہے۔ ''جاہلِ ہند'' و ''داناے تبریز'' لکھتے ہیں، یا ''ابوجہل ہند''، پیمبرِ تبریز'' لکھتے ہیں۔ ہاں، صاحبانِ فہم و فراست، للہ فرماؤ کہ یہ دخل میری طرف سے بجا ہے یا بے جا!

فصل:۱۰

مولوی بُرہان پرستِ فارسی مداں صفحہ ۱۰ میں ''مؤیدِ بُرہان'' کے ''فازہ'' و ''خمیازہ'' کی بحث میں لکھتا ہے، ''ظنِ غالب آں کہ غالبِ عربی مداں راغیاث گم راہ کردہ باشد۔'' عیاذاًباللہ، اگر غالب جامعِ غیاث اللغات کو آدمی جانتا ہو تو وہ خود آدمی نہیں۔ ایک بار ''علمِ شے بہ از جہل شے'' کی رعایت کر کے، اس کتاب کو سراسر دیکھ لیا، جب دیکھا کہ جا بجا قتیل کے کلام کا حوالہ دیتا ہے اور ماخذ اس کا فنِ لغت میں ''چہار شربت'' اور ''نہر الفصاحت'' ہے، کتاب پر اور مؤلف پر لعنت بھیجی۔ مدرس جی اتنا نہ سمجھے کہ جو میاں اِنجو کو نہ مانے گا، وہ میاں جی غیاث الدین کو کیا مانے گا۔ بارے، جب رام پور جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے صاحب زادگانِ عالی تبار اور رؤساے نام دار سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہیں تو اس شخص کا یہ معلوم (ہوا) کہ ایک ملّاے مکتب دار تھا۔ نہ رئیس کا رُوشناس، نہ اکابر شہر کا آشنا، ایک گم نام ملّا، مکتب دار۔ چند صاحب مقدور لڑکے اُس کے مکتب میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے صرفِ زر میں اُس کو مدد دی۔ مثل بندر کے، جس نے تجار کی تقلید کی تھی، ایک فرہنگ لکھ کر چھپوائی۔ خدا کا شکر ہے کہ غالب مانند مدرس صاحب کے ہر دل عزیز نہیں۔ گل محمد خان بلوچ کو ایرانی، اور سراج الدین علی خان آرزو کو نواب اور لالا ٹیک چند کو

راجا کبھی نہ لکھے گا۔ مولوی احمد علی جہاں گیر نگری عالم ہیں مگر ان معنوں میں کہ صرف ونحو کے دو چار رسالے پڑھ لیے ہیں اور فاعل و مفعول سے لگا لگا کر رکھتا ہے؟ باقی فہم، تمیز، انصاف، حیا، ان چاروں صفتوں کا پتا نہیں۔ مدرسی کا عہدہ ہاتھ آنا، بہ حسبِ اتفاق ہے نہ ازروے استحقاق۔

ز دل بری نتواں لاف زد بہ آسانی
ہزار نکتہ دریں کار ہست تا دانی

فصل:۱۲

مدرس صاحب کا یہ قاعدہ کہ سوال کا جواب نہ دیں، اور خارج از بحث دفتر [کے] دفتر لکھے جائیں، ایسا استوار ہے کہ کبھی چُوکتے نہیں۔ چناں چہ صفحہ ۶۸ اور صفحہ ۱۶۹ میں ''پازاچ'' کی بحث میں حضرت نے کیسے کیسے کنویں جھانکے ہیں۔ ''زاچ'' کو ''جیم'' سے بھی جائز رکھتے ہیں، میں کہتا ہوں، کبھی نہیں ہوسکتا۔ ''زچہ'' بجیمِ سہ نقطہ، ''زاچ''، بجیمِ سہ نقطہ ہے، جو اس کو جیمِ ابجد سے کہے، وہ غلط گو، اور اس کا قول مردود! ...... پھر دوسرے صفحے میں ''پادیر'' کو ''دال'' سے، اور ''ذال'' سے، اور ''زے'' سے، تینوں حرفوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ بڑی بات ہے کہ ''ارتنگ'' کی طرح آدھے حروفِ تہجی اس لغت میں درج نہیں کیے۔

غالب پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

''ابطالِ ضرورت'' میں ''عفو'' کو بروزنِ ''رفو'' لکھا ہے، اور یہ مصرعِ شیخ سعدی سند لایا ہے۔ مصرع:

عفو کردم از وے عمل ہاے زشت

میں جانتا ہوں اس تصرف کو اور مانتا ہوں، مگر سر پیٹتا ہوں کہ یہ مصرع یوں ہے۔ مصرع:

ز وے عفو کردم عمل ہاے زشت

باقی اور قصائد میں، اور مثنویوں میں قدما کی، ''عفو'' بروزنِ ''رفو'' آیا ہے۔ سکون وحرکت و تخفیف وزیادتی کا ہم دگر بدل جانا محض براے ضرورتِ وزنِ شعر ہے، نثر میں اس طرح لکھنا، اور اس کو بجاے خود ایک لغتِ مستقل جاننا حماقت ہے اور یہ سب سے زیادہ جامعِ ''بُرہان قاطع'' کا ڈھنگ ہے۔

انھی صفحوں میں مولوی مجھے لکھتا ہے کہ ''غالب سگِ کیست؟ میں کہتا ہوں کہ غالب آستانِ شیرِ خدا کا کتاّ ہے، علیہ التحیّہ والثناء، اسی مقام پر یہ شعر لکھا ہے:

سگِ کیست روباہِ نازورمند
کہ شیرِ ژیاں را رساند گزند

''شیر'' اسد کا ترجمہ ہے، اور میرا نام اسد ہے، بس میرا مقابل روباہ ہے، اور چوں کہ میرا مقابل مولوی ہے تو وہ بخوبی لومڑی ٹھہرا، البتہ مجھ کو کیا گزند پہنچائے گا؟ صاحبو، انصاف چاہتا ہوں، مولوی احمق ہے یا نہیں؟ اگر عقل رکھتا ہوتا، تو اسد کے مقابلے میں یہ شعر نہ لکھتا۔

فصل:۱۵ میں آغا احمد علی کے کچھ ہفوات درج کر کے غالب لکھتے ہیں:

بس اب میں عاجز آ گیا، کہاں تک لغت بعد لغت دیکھے جاؤں، خرافات، واہیات، جھوٹ، لغو، مہمل! اب ورق ورق اور صفحہ صفحہ کہاں تک دیکھوں گا، دیکھوں گا تو سہی، مگر چھوڑتا جاؤں گا، جستہ جستہ جواب لکھوں گا۔ آخر مجھ کو آغا محمد حسین کی خدمت میں بھی حاضر ہونا ہے، اور وہ لغاتِ لکھتے ہیں، جو ''پنج آہنگ'' کے بعد ''درفش کاویانی'' میں مندرج ہوئے ہیں۔

فصل:۱۶

اس فصل میں جی یہ چاہتا ہے کہ مولوی صاحب سے کچھ باتیں کرلوں...... تم محمد حسین

کے تبریزی مولد ہونے پر اصرار کیوں کرتے ہو؟ ظہوری کو نظیر گزرانتے ہو، اور یہ نہیں جانتے کہ ظہوری کا مولد ترشیز تھا، اس کو تم نے تبریزی مولد کیوں کر جانا؟ دلیل اس کے تبریزی ہونے پر وہ بودی گزرانی کہ نسبت اس کے مکڑی کے جالے کو مضبوط کہنا روا ہے۔ فرماتے ہو کہ لغات ہندی اچھی طرح نہ بولنا اُس کے ولایت زا ہونے کی دلیل ہے۔ غور تو کرو، بولتے اُس کو کس نے سنا ہے؟ آپ نے بھی تحریر دیکھی، فقیر نے بھی۔ جو علما و شعرا ایران سے آئے، لہجہ ان کا ہندی نہیں ہوا، املا اہلِ ہند کی املا کے موافق رہی، مثلاً ''تھوڑا''، ''گھوڑا''، جان جائیں گے کثرتِ سماعت سے کہ یہ دونوں ترکیبیں ہندی ہیں، مگر تلفظ میں ''تورا'' اور ''گورا'' کہیں گے۔ ''چوکھنڈی'' شعر میں اسی صورت سے لکھیں گے، مگر بولیں گے ''چوکنڈی۔'' حضرت ظہوری کے ممدوح کا ایک طنبورہ تھا، بہت بڑا، ہاتھی پر چلتا تھا اور نام اس کا ''موٹے خان'' تھا بہ واوِ مجہول و تائے ثقلیۂ ہندی۔ مولانا ظہوری اس طرح جانتے ہوں گے، مگر تلفظ میں بہ تائے قرشت استعمال کرتے ہوں گے۔

فصل: ۱۷

اور یہ فصل آخر ہے۔ ہم ایک ہی فصل میں وہ لغات لکھیں گے، اور وہ قباحتیں ''بُرہانِ قاطع'' کی تالیف کی ذکر کریں گے جو بعدِ اتمام ''پنج آہنگ'' [قاطع بُرہان'' ؟] ہم پہنچی ہیں اور صرف ''درفشِ کاویانی''، میں لکھی گئی ہیں۔ ہر لغت کی ابتدا میں فصل نہ لکھیں گے، تاکہ عبارت یک دست لکھی جائے، اور یہ نگارش جلد اختتام پائے۔

پانچ صفحوں کی اس طویل فصل کا خاتمہ حسبِ ذیل سطور پر ہوتا ہے:

اگرچہ ابھی پرسشیں بہت باقی ہیں، لیکن بڑھاپا اور امراض اور ضعفِ مفرط نہیں لکھنے دیتا۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں، لیٹے لیٹے مسوّدہ کیا، اور احباب کو دے دیا، انھوں نے صاف کرلیا۔ اب میری تحریر تو تمام ہوئی، احباب صاف کرلیں

تو مطبع میں حوالے کروں اور بعدِ انطباع، جیسا کہ دیباچے میں وعدہ کر آیا ہوں، عمل میں لاؤں۔ یہ جو کچھ بہ سبیلِ سوالات لکھا ہے، مولوی صاحب سے اس کا جواب جدا جدا مانگتا ہوں، اور یہ کہتا ہوں کہ سُنو صاحب، نفسانیت کا برا ہو، اکابرِ امت ہیں باہم کیا کیا ناخوش و ناشائستہ کلام درمیان آئے ہیں۔ حکیم شفائی صفاہانی نے مولانا عرفی شیرازی کی کیا کیا مذمتیں کی ہیں۔ ایک قصیدے میں اُس مرحوم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔ شعر:

ہزار قطعۂ نم کردہ در بغل رفتی
ز ناکسانِ جہاں تا بہ میرزا خانی

اور یقیں ہے کہ عرفی و شفائی کے زمانے میں اُسی قدر تقدیم و تاخیر ہو، جتنی ''بُرہان'' و غالب کے عہد میں تھی۔ علمائے ماوراء النہر اور علمائے مشہد میں ایسے مکاتبات کی آمد و رفت درمیان رہی ہے کہ فریقین کی توہین و نفریں سے مملو ہے بلکہ خود شاہِ ایران اور سلاطینِ روم کے درمیان وہ نامے جاری ہوئے ہیں جس میں سراسر مغلّظ گالیاں مرقوم ہیں۔ غرض اس اظہار سے یہ ہے کہ جہاں عمائدِ اہلِ اسلام و سلاطینِ اہلِ اسلام کی وہ باہم ناسزا تحریریں صفحۂ روزگار پر یادگار رہیں گی، وہاں تمھاری ہماری بھی بد کہا و صفحۂ دہر پر نمودار رہیں گی۔ نہیں نہیں، صرف اللہ کا نام رہ جائے گا، اور کچھ نہیں! ویبقیٰ وجہ ربک ذی [ذو] الجلال الاکرام۔

یہ سترہ فصلیں ''تیغ تیز'' (طبع دہلی، ۱۸۶۷ء) کے صفحہ ۲۹ پر ختم ہوتی ہیں۔ صفحات ۳۰، ۳۱، ۳۲ پر غالب کے ۱۶ مختصر استفتا ہیں اور شیفتہ کے مختصر جوابات ہیں۔ ''استفتا'' کی تمہید میں غالب لکھتے ہیں:

صاحبانِ قوتِ ناطقہ و قوتِ عاقلہ سے کہ وہ مقربانِ بارگاہِ مبدءِ فیاض ہیں، غالب کی یہ استدعا ہے کہ جب یہ تحریر کہ گویا ''استفتا'' ہے، نظر سے گزرے تو احد اللغتین میں سے جو لغتِ صحیح ہو، اس کی صحت اور لغت غلط کی غلطی لکھ کر خاتمۂ عبارت پر اپنا نام لکھ

دیں۔ مثلاً جہاں میں نے لکھا ہے کہ ''چشمِ عیب بیں'' صحیح ہے، یا ''چشمِ عیب ساز''
اس کے جواب میں رقم فرمائیں کہ ''چشمِ عیب بیں'' صحیح اور ''چشمِ ساز'' غلط ہے۔ یہ
عبارت چھاپی جائے گی، اس واسطے ضرور ہے کہ فتوے میں توضیح ہو۔

اس کے بعد سولہ سوالات اور ان کے جوابات درج ہیں، کچھ یہاں لکھے جاتے ہیں:

سوال ۱: لغتِ فارسی کی حقیقت اور حروف کی حرکت میں فردوسی اور خاقانی سچے ہیں یا ہندوستانی فرہنگ لکھنے والے؟ (م ص)

جواب: فردوسی و خاقانی سچے ہیں، ہندوستانی ان کے مطابق لکھیں تو سچے، ان کے برخلاف لکھیں تو جھوٹے۔ (محمد المدعو بہ مصطفیٰ)

سوال ۲: ''پیدایی'' و ''زیبایی'' صحیح، اور ''پیدایش'' و ''زیبایش'' غلط یا چاروں لفظ صحیح؟ (م ص)

جواب: چاروں صحیح۔ (محمد المدعو بہ مصطفیٰ)

سوال ۵: فرہنگ نویسِ حال کی رائے اگر فرہنگ نویسِ ماضی کی رائے سے مطابق ہو، خواہی بحسبِ اتفاق، خواہی از روئے مشاہدہ، یہ سرقہ ہے یا تطابق رائے؟ (م ص)

جواب: یہ تطابقِ رائے ہے، سرقے سے کیا علاقہ؟ (محمد المدعو بہ مصطفیٰ)

سوال ۹: ''پالوایہ'' ایک لغت ہے، فرہنگ نویس کو اس کا ہم وزن ''چار پایہ'' لکھنا چاہیے یا ''چارخایہ''؟ (م ص)

جواب۔ وزن دونوں صحیح ہیں، لیکن ''چار پایہ'' لکھنے والا آدمی ہے اور ''چارخایہ'' لکھنے والا چار پایہ۔ (محمد المدعو بہ مصطفیٰ)

سوال ۱۴: ''پا'' اور ''پائے'' بہ اضافۂ تحتانی، جس کو عربی میں ''رجل'' کہتے ہیں، ہندی میں اس کا نام ''پانو'' مع النون ہے، یا پاؤ بے نون؟ (م ص)

جواب۔ ''پانو'' کو ''پاؤ'' نہ کہے گا، مگر مجنوں۔ (محمد المدعو بہ مصطفیٰ)

آخری سوال کے جواب کے بعد ''راقم محمد المدعو بہ مصطفیٰ ختم اللہ بالحسنیٰ'' مرقوم ہے۔
اس کے بعد حالی، سعادت علی اور نواب ضیاء الدین احمد رخشاں دہلوی کے صداقت نامے درج

ہیں:

سب جواب مجیب کے صحیح ہیں۔

الطاف حسین پانی پتی عفی اللہ تعالیٰ عنہ

سب جواب دونوں مجیبوں کے بالصواب ہیں۔

محمد سعادت علی، مدرس گورنمنٹ اسکول، دہلی

ہر شانزدہ گانہ سوال کے جواب میں میں بھی نواب محمد مصطفیٰ خاں صاحب کا ہم زبان و ہم داستان ہوں۔

الراقم الرآثم محمد الملقب بہ ضیاء الدین عفی عنہ

غالب کی ''تیغِ تیز'' آج سے ۱۳۰ سال پہلے اکمل المطابع دہلی سے ۱۸۶۷ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ پھر اس کا کوئی اڈیشن نہ نکلا۔ کوئی تیس سال پہلے قاضی عبدالودود ''قاطعِ بُرہان و رسائلِ متعلقہ'' دو جلدوں میں چھاپنا چاہتے تھے۔ پہلی جلد، جس میں غالب کے پانچ رسالے ہیں، جن میں ''تیغِ تیز'' بھی ہے، ۱۹۶۷ء میں پٹنہ سے شائع ہوئی۔ جلد دوم، جلد اوّل کا جز و لاینفک ہے۔ اس جلد میں ان کا لکھا ہوا مقدمہ، حواشی و اشاریہ جات شائع ہونے تھے، لیکن بوجوہ شائع نہ ہو سکے۔ یہ رسالہ اس مجموعے میں چھپا ضرور لیکن اس طرح کہ نہ اس پر کوئی مقدمہ ہے نہ حواشی و تعلیقات۔ دوسری جلد کے انتظار میں اس کا اچھی طرح اشتہار بھی نہیں ہوا۔ یہ مجموعہ چھپا لیکن چُھپا رہا اور اہلِ نظر سے بہت حد تک پوشیدہ رہا۔ کتابی شکل میں تو بہر حال یہ رسالہ صرف ایک بار غالب کی زندگی میں شائع ہوا[1]

''تیغِ تیز'' کے جواب میں ''تیغِ تیز تر'' اور ''شمشیرِ تیز تر''، لکھی گئیں۔ یہ دونوں میری نظر سے نہیں گزریں۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:[2]

''مؤیدِ بُرہان'' کے جواب میں غالب نے ایک قطعہ لکھا، جس کا پہلا شعر ہے:

مولوی احمد علی، احمد تخلص، نسخۂ

درخصوصِ گفتگوے پارس انشا کردہ است

جس میں اگر چہ کل اکتیس شعر تھے لیکن ''مؤید'' جیسی دس کتابیں بھی اس کی تاثیرِ جہاں گیر کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔اس پر ادبی جنگ نے نثر کے بجائے نظم کی شکل اختیار کرلی۔غالب ہی کی زمین میں موافق ومخالف چار سو تیرہ شعر کہے گئے۔غالب کا جواب سب سے پہلے مولوی احمد علی کے شاگرد عبدالصمد فدا اسلہٹی نے دیا۔اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علم وادب میں بہت معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔فدا کے جواب میں سید شاہ باقر علی باقر بہاری (متوفی: ۱۸۳۱ء) اور خواجہ فخر الدین حسین سخن نے دو قطعے لکھے۔فدا نے پھر ان قطعوں کا جواب دیا۔یہ سارا مجموعۂ منظومات ''تیغِ تیزتر'' کے نام سے چھاپ دیا۔

اب ''شمشیرِ تیزتر'' کا حال سنیے:[۳]

(شش ماہی غالب، ادارہ یادگار غالب کراچی، شمارہ ۱۹، ۲۰۰۰ء، ص ۱۹۱۔۲۰۵)

حوالہ جات

۱۔ ''تیغِ تیز'' غالب کے دو اور رسائل ''لطائف غیبی'' اور ''سوالات عبدالکریم'' کے ساتھ، بہ تصحیح و تحقیق سیّد وزیر الحسن عابدی، ''افاداتِ غالب'' کے نام سے پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوچکی ہے۔غالب کی سوسالہ برسی کے موقعے پر شائع شدہ ''مجلسِ یادگارِ غالب'' کی مطبوعات میں ''افاداتِ غالب'' کا نمبر ۱۲ ہے۔(ادارہ)

۲۔ غالب ''طبعِ چہارم، لاہور، دسمبر ۱۹۴۶ء، ص ۴۴۳

۳۔ ایضاً، ص ۴۴۵

آغا احمد علی جہاں گیرنگری مؤلّفِ ''مؤیدِ بُرہان'' نے غالب کی تصنیف ''تیغِ تیز'' کے جواب میں ایک رسالہ بہ زبانِ فارسی ''شمشیرِ تیزتر'' کے نام سے لکھا جو ۱۸۶۸ء میں مولوی غلام نبی کے مطبعِ نبوی میں عبداللہ خان کے زیرِ اہتمام چھپا۔اس کے آغاز میں فدا کا رسالہ ''تیغِ تیزتر'' بھی شامل کردیا گیا۔

غرض ''قاطعِ بُرہان'' کی اشاعت پر جو ہنگامہ شروع ہوا تھا وہ نظم ونثر کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا ۱۸۶۸ء میں ''شمشیرِ تیزتر'' پر ختم ہوا۔

''شمشیرِ تیزتر'' کے نسخے کم یاب، بلکہ نایاب کے حکم میں ہیں۔غلام رسول مہر مرحوم کی اطلاع کے مطابق اس کا ایک نسخہ شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی کے پاس تھا۔وہ اب پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

تنظیم الفردوس

نواب یوسف علی خاں ناظم کی ایک غزل:
غالب کی دست نوشتہ غیر مطبوعہ تصحیح

نواب یوسف علی خان ناظم اٹھارویں صدی عیسوی میں قائم ہونے والی ہندوستانی ریاست رامپور کے حکمراں تھے۔ ۱۸۱۵ء کو پیدا ہوئے۔[۱] انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں مرزا غالب سے فارسی پڑھی، مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی سے عربی اور دیگر علوم عقلیہ، منطق وغیرہ کی تحصیل کی۔ غالب کے علاوہ خلیفہ غیاث الدین رامپوری سے بھی فارسی پڑھی،''[۲] ۱۸۵۵ء کے لگ بھگ تخت نشیں ہوئے۔[۳] ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دارو گیر میں احتیاط سے کام لیا بلکہ انگریزوں کو گزند سے بچایا۔ ان خدمات کے صلے میں ۱۸۵۹ء میں خلعت، سلامی میں اضافہ اور سرکاری مراسلت میں القاب و آداب مقرر ہوئے۔[۴] جب کہ ۱۸۶۰ء میں بریلی میں نیا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا۔[۵] نواب صاحب نے اس عطیے کے موقع پر یہ قطعہ موزوں کیا۔

جب گورنمنٹ سے ہوا حاصل
ملک مجھ کو بصیغۂ انعام
ناظم ازروئے ہمتِ عالی
سالِ بخشش ہے ''بخششِ حکام''[۶]

غالب نے بھی اس موقع پر تہنیتی قطعہ لکھا جو کلیاتِ فارسی میں شامل ہے۔[۷] ۱۸۶۱ء

میں دربارِ الٰہ آباد کے موقع نواب صاحب کو نائٹ کا خطاب اور تمغا عطا کیا گیا۔[۸] ۲۱/اپریل ۱۸۶۵ء کو انتقال ہوا۔[۹] ۲۸/جنوری ۱۸۵۷ء کو غالب نے نواب یوسف علی خان کے نام فارسی میں جو پہلا مکتوب تحریر کیا اس میں نواب صاحب سے ایک تعلق سابق کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ خط مکاتیب غالب میں شامل ہے۔[۱۰] بقول امتیاز علی عرشی یہ تعلق سابق وہ رشتۂ شاگردی و استادی تھا جو اس وقت استوار ہوا تھا جب نواب صاحب اپنے والد کی تخت نشینی سے قبل کچھ عرصے تک دہلی میں قیام پذیر رہے تھے۔ اس وقت طالب علم تھے اور ان کے چچا نواب سید عبداللہ خان بہادر اور نواب سید عبدالرحمٰن بہادر سے مرزا صاحب کی دوستی تھی۔ انھی حضرات کے کہنے پر نواب یوسف علی خان نے غالب سے فارسی کی تحصیل کی تھی۔[۱۱]

ناظم فروری ۱۸۵۷ء میں غالب کے شاگرد ہوئے۔[۱۲] اصلاحِ سخن کے باب میں امیر مینائی نے ''انتخابِ یادگار'' میں لکھا ہے کہ ''پہلے مومن خاں مومن صاحب دہلوی سے مشورہ رہا۔ پھر اسداللہ خان غالب سے تلمذ ہوا۔''[۱۳] جب کہ مالک رام کے مطابق غالب نے جنوری ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی تحریک پر رامپور کے والی کو ایک قصیدہ بھیجا۔ زمین وہ پہلے ہی ہموار کر چکے تھے لہٰذا نواب صاحب نے نہ صرف قصیدے کی پذیرائی کی بلکہ غالب کی شاگردی اختیار کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔[۱۴] اور مرزا کو قصیدے کی رسید اور شاگردی کی درخواست کے ساتھ ایک خط لکھا جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اس سے قبل کوئی شعر کبھی موزوں نہیں کیا تھا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کی زبانی غالب کا کلام سن کر خط کتابت کی خواہش پیدا ہوئی جس کی تکمیل اس صورت کر رہے ہیں کہ چند اشعار موزوں کر کے امیدوارِ شاگردی ہو رہے ہیں۔[۱۵] ناظم کے اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ اگر ناظم نے مومن کی شاگردی کی ہوتی تو یہ نہ لکھتے کہ ''میرے مشفق! مجھے آج تک کبھی ایک مصرع تک موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔''[۱۶] گویا ''اگر وہ اس سے پہلے شعر کہہ رہے ہوتے اور مومن سے اصلاح کا سلسلہ ہوتا تو یہ بات پوشیدہ رہنے والی نہ تھی اور نواب صاحب کو اس غلط بیانی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔''[۱۷] اس کے علاوہ ایک دلچسپ پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مالک رام کے مطابق'' امیر مینائی لکھتے ہیں کہ ناظم نے مجھ سے بھی اصلاح لی۔''[۱۸]

مالک رام، امیر کا یہ بیان رقم کرنے کے بعد ''واللہ اعلم'' کہتے ہیں۔ جب کہ ''انتخابِ یادگار'' میں امیر نے جہاں ناظم کا ذکر کیا ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔ انھوں نے مومن، غالب اور اسیر سے ناظم کے تلمذ کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔[19]

ناظم کا دیوان پہلی مرتبہ ۱۲۷۸ھ میں مطبعِ حسینی سے شائع ہوا۔ دیوان کی دوسری اشاعت ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ پہلی اشاعت میں بقول امیر مینائی زیادہ تر غالب کا دیکھا ہوا کلام شامل ہے اور دوسری مرتبہ منشی مظفر علی اسیر صاحب سے اصلاح شدہ کلام شامل تھا۔[20] عام طور پر رواں اور چست بندشیں استعمال کرتے ہیں۔ شوخی اور رنگینی ان کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔ مکالمے کے انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ مصرعے موزوں کرتے ہیں۔ تلامذۂ غالب میں مالک رام نے ان کے اکثر کلام کو رنگِ غالب میں ڈھلا ہوا قرار دیتے ہوئے اس شبہہ کا اظہار کیا ہے کہ ''یہ کلامِ خوش استاد نے خود کہہ کر شاگرد کے حوالے کر دیا ہے''۔[21] جب کہ ان کی شاعری کے بارے میں امیر کا کہنا ہے ''پایۂ شاعری کو ایسا بلند کیا کہ روح القدس نے بھی پسند کیا''[22] اور کسریٰ منہاس نے ان کی ایک غزل کے ذیل میں رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ ناظم کی بڑی تیکھی غزل ہے جس پر بعض اساتذہ نے بھی مصرعے بہم پہنچائے اور مخمس کہے ہیں۔''[23] جب کہ ایک شعر کی اصلاح درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''غالب کی خوبیِ بیان نے اس شعر میں غالب کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔''[24]

غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم کی جلد سوم میں نواب یوسف علی خان ناظم کے نام چالیس خط شامل ہیں۔[25] اس مجموعے میں شامل ناظم کے نام غالب کا پہلا مکتوب کچھ یوں ہے:

''حضرتِ ولی نعمت آیۂ رحمت! سلامت

آداب بجا لاتا ہوں۔ غزلوں کے مسودات کو صاف کر کے حضور میں بھیجتا ہوں۔ مسودات اپنے پاس رہنے دیے ہیں، اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں تلف ہو جائے تو میں پھر اس کو صاف کر کے بھیج دوں، ورنہ موقع حک و اصلاح مجھے کیا یاد رہے گا۔

میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسمِ سامی اور نامِ نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیساں، ان میں سے جو پسند آئے، وہ رہنے دیجیے، مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک۔

زیادہ حدِ ادب: تم سلامت رہو قیامت تک

عنایت کا طالب

یکشنبہ ۱۵ فروری ۱۸۵۷ء — غالب''[26]

مذکورہ بالا خط میں دو امور بیان ہوئے ہیں۔ پہلا غزلوں کے مسودات سے متعلق ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''صاف کر کے حضور میں بھیجتا ہوں۔'' غزلوں کے مسودات کی واپسی اور تخلص کا تقرر، دوسرا موضوع ہے۔ یکم مارچ ۱۸۵۷ء کو ناظم نے غالب کو خط کا جواب دیا اور تخلص کے لیے پسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے لکھا ''منجملہ الفاظ تخلص لفظ (ناظم) مطبوع طبعِ نیاز گشت۔''[27]

اسی خط کا عکس بخطِ غالب اس وقت میرے سامنے ہے جو کہ نبیرۂ امیر مینائی محترم اسماعیل مینائی صاحب کے توسط سے مجھے حاصل ہوا ہے۔ مذکورہ خط کے حاشیے پر یہ عبارت درج ہے۔

''عکسِ خط میرزا اسداللہ خان غالب دہلوی غفرلہ دارالانشاء (انگشت نمبر ۱۴)'' [کذا][28]

راقمۃ الحروف کو غالب کے اس خط کی جو عکسی نقول محترم مینائی صاحب نے مہیا کی ہے اس میں ناظم کی ایک غزل، دو اشعار اور حاشیے میں غالب کی کی دست نوشتہ تصحیح درج ہے۔ اس دستاویز کا سرنامہ یہ ہے ''ناظم ایسا کہاں سے آیا خط'' جس کے بعد ایک غزل جو انیس (۱۹) اشعار کی ''کی احتیاط'' کی ردیف میں، ہے درج ہے۔[29] اس کے علاوہ ایک غزل کے دو اشعار بردیفِ ''خط'' مزید درج ہیں۔

پہلے یہ تینوں غزلیں درج کی جاتی ہیں تاکہ ان کا مجموعی مزاج قارئین کے سامنے آ جائے۔ سب سے پہلے وہ غزل جو از مطلع تا مقطع اس ورق پر لکھی ہوئی ہے اور دیوانِ ناظم میں

اسی طرح موجود ہے چند اشعار کی ترتیب مختلف ہے۔

کرتا ہوں خوں سے دامنِ قاتل کی احتیاط / اس خستگی میں دیکھیے بسمل کی احتیاط

اس رخ کا جلوہ تجھ کو مضر ہے دلِ فگار / سب چاندنی سے کرتے ہیں بسمل کی احتیاط[30]

ساحل پہ آ کے لگتی ہے ٹکر سفینے کو / ہجراں سے وصل میں ہے سوا دل کی احتیاط[31]

گھس گھس کے تار تار ہوئیں مثلِ موئے سر / کیا ہو سکے جنوں میں سلاسل کی احتیاط

لکھتا تھا حالِ سوزِ جگر پر نہ لکھ سکا / کرنی پڑی ہے کلک و انامل کی احتیاط

بزمِ بتاں میں آئے ہو لگ جائے گی نظر / لازم ہے اپنی شکل و شمائل کی احتیاط

مجنوں ہے ساتھ ناقے کے پھر کیوں نہ ہو بھلا / محمل نشیں کو پردۂ محمل کی احتیاط

سب اہلِ بزم بیخود و بے حس ہیں ساقیا / ناچار تجھ کو چاہیے محفل کی احتیاط

رہزن سے بچ کے آئے تو کھٹکا ہے چور کا / ناظم ہلاک کرتی ہے منزل کی احتیاط[32]

اب وہ غزل[33] درج کی جاتی ہے جس کے صرف پہلے دو شعر اس تحریر میں درج ہیں۔

بے دیے لے اڑا کبوتر خط / یوں پہنچتا ہے اوپر اوپر خط

پرزے پرزے ہوا سراسر خط / ایک خط کے ہوئے بہتر خط

قتل ہوتے ہیں نامہ بر ہر روز / لاش پر لاش اور خط پر خط

روز اک نامہ بر کہاں سے آئے / یونہی رکھ چھوڑتا ہوں لکھ کر خط

کیا قلم نے شرر فشانی کی / پھلجھڑی بن گیا مرا ہر خط

جا رہیں گے کل ان کے ہمسائے / لکھ کے دے آئے آج ہم سر خط

قطعہ

جو کہ لیتے نہیں ہیں میرا نام / وہ لکھیں گے مجھے مقرر خط

کس طرح سرنوشت کو بدلوں / خط میں مل جائے غیر کے گر خط

پڑھ تو لیں گے وہ نامہ میرا بھی / آتے رہتے ہیں اس کے اکثر خط

دیکھ کر نام پھینک دیں گے ضرور / پھر نہ لیں گے کبھی مکرر خط

ڈاک گھر میں ٹکٹ نہیں باقی / ناظم اتنے گئے ہیں خط پر خط

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے[34] کہ وہ تیسری غزل بھی درج کر دی جائے جس کا ایک مصرع سرنوشت کے طور پر درج ہے۔

غیر نے پڑھ کے کیوں سنایا خط / پڑھ نہیں جانتے تم آیا خط

جیب سے قاصد بر کی پایا خط / مرگیا آپ پر بچایا خط

مٹ گئے حرف بسکہ تھیں غمناک / میں نے آنکھوں سے کیوں لگایا خط

ہاتھ میں خط لیا کہ دم نکلا / واہ کیا اچھے وقت آیا خط

تا کسی کی کہیں نظر نہ لگے / دوستوں سے ترا چھپایا خط

وہ نہ دیں خط تو نامہ بر کیا لائے / کیا کہیں اس نے پیچ کھایا خط

طائرِ نامہ بر کہاں پیدا / تیر میں بندھ کے مجھ کو آیا خط

قطعہ

ایک دھوکا دیا تھا پر نہ چلا[35] / نامہ بر واں سے پھیر لایا خط

نام کو تو نہیں بدل سکتا / غیر کے خط میں گر ملایا خط

پڑھ کے بازو پر تم نے باندھ لیا / ناظم ایسا کہاں سے آیا خط

مذکورہ دستاویز میں غزل اور دو اشعار کے بعد بنیادی اشعار کے حاشیے میں ایک عبارت بخطِ غالب درج ہے جو کہ ان دو اشعار کے ذیل میں ہے:

بے دیے لے اوڑا کبوتر خط

یوں پہنچتا ہے اوپر اوپر خط

پرزے پرزے ہوا سراسر خط

ایک خط کے بنے بہتر خط

پہلے مصرے کے پہلے ہی لفظ کے تعلق سے غالب کی دست نوشتہ عبارت ملاحظہ فرمائیے جو لفظی اصلاحی کے طور پر لکھی گئی ہے اور متن کے حاشیے میں درج ہے؛

''اگر بن دیے رکھنا منظور نہیں تو بے دیے رہنے دیجیے لیکن میرے نزدیک بن دیے فصیح ہے۔ چناں چہ میرا شعر ہے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بَن جائے ہے کچھ ایسے کہ بِن آئے نہ بنے

اس سے قطع نظر یہ جو مثل مشہور زبان زدِ جمہور ہے کہ 'بِن آئے کوئی نہیں مرتا' اس کو کوئی کیا کرے گا۔ غرضکہ [کذا] میں اپنی طرف سے اس لفظ کی سفارش کرتا ہوں مگر آپ کی اطاعت منظور ہے۔ ایک بار عرض کر کے پھر نہ کہوں گا۔ غالب ۱۲''[۳۶]

قبل اس کے کہ بات کو آگے بڑھایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلام ناظم پر غالب کی دی گئی اصلاحات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ نواب یوسف علی خان ناظم کے حوالے سے تصحیحات غالب کے ذیل میں صفدر مرزا پوری نے مشاطۂ سخن جلد اول میں دو اشعار پیش کیے ہیں:

ناظم — آج وہ لے گیا دل چھین کے میرا مجھ سے
جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا

اصلاح — دل کے لینے میں یہ قدرت اسے اللہ نے دی
جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا

ناظم — گر نہیں تیری کرامت تو یہ کیا ہے ساقی
ہم نے ساغر کو تری بزم میں چلتے دیکھا

اصلاح — ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر سب نے اسے بزم میں چلتے دیکھا[۳۷]

ان ہی دو اشعار میں سے پہلے شعر کا حوالہ سہیل عباس بلوچ نے بھی اپنے تحقیقی مقالے

''اردو شاعری میں اصلاحِ سخن کی روایت'' میں بھی دیا ہے۔[۳۸]

''غالب کی اصلاحیں'' کے عنوان سے کسریٰ منہاس کا ایک مضمون 'نقوش' کے غالب نمبر میں شامل ہے۔ اس مضمون میں کسریٰ منہاس نے مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ یہ اصلاحیں درج کی ہیں۔

ناظم — جو اپنے ہی سے اپنا پردا کریں
وہ بندِ قبا کس طرح وا کریں[۳۹]

اصلاح — تو بندِ قبا کس طرح وا کریں

ناظم — لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں
عاقل نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط[۴۰]

اصلاح — احمق نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط

ناظم — لگاوٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک ہو جائے
سمجھے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے

اصلاح — لگاوٹ غیر اس کو جلا کر خاک کر دیتی[۴۱]

ناظم — خستۂ پیکانِ غم ہر اک جوان و پیر ہے
اور پھر دیکھو تو ترکش میں ہی پنہاں تیر ہے

اصلاح — خستۂ پیکانِ غم ہر یک جوان و پیر ہے[۴۲]

ناظم — سیاح جہاں گرد ہیں آ نکلے یہاں بھی
کچھ تیرے پجاری تو نہیں اے بتِ چیں ہم

اصلاح — سیاح جہاں گرد ہیں آ نکلے ہیں یاں بھی[۴۳]

یہ مشکل ضرور ہے کہ غالب کی چند ہی اصلاحیں دستیاب ہیں اور ان کی مدد سے جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ غالب اپنے شاگردوں کے صاف اور درست اشعار کو غیر ضروری طور بدلنا پسند نہ کرتے تھے۔ محض اسقام و عیوب کے مقام پر ہی اصلاح دیا کرتے تھے۔[۴۴]

مذکورہ جائزے کے بعد جب ہم اس دست نوشتہ تحریر کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس دستاویز کی اہمیت کے کئی قابلِ لحاظ پہلو سامنے آتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ غالب کی تجویز کردہ اس دست نوشتہ اصلاح کو ناظم نے ملحوظ نہیں رکھا اور ان کے دیوان میں شامل یہ شعر مجوزہ اصلاح کے بغیر شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ غالب کی تجویز کردہ بقیہ تمام اصلاحوں کو ناظم نے اپنے دیوان میں ملحوظ رکھا ہے۔ اگر ناظم کا وہ خط سامنے رکھا جائے جو انھوں نے رشتۂ شاگردی اختیار کرنے کی خاطر غالب کو لکھا تھا تو مذکورہ اصلاح کی جانب سے یہ بے نیازی کچھ عجیب محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ اس خط کا ذکر کئی بار آ چکا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس مکتوب کی اردو عبارت پیش کر دی جائے؛

''میرے مشفق! مجھے آج تک کبھی ایک مصرع تک موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن محض مولوی فضل حق موصوف کی زبانی آپ کا بلند پایہ کلام سننے سے دل نے چاہا کہ کسی طرح آپ سے خط کتابت کا سلسلہ جاری ہو جائے۔ چوں کہ اس کے لیے اس سے بہتر کوئی سبیل میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے میں نے چند شعر غلط سلط موزوں کیے ہیں، امیدوار ہوں کہ ان غزلوں کی اصلاح اور جدید مصرع طرح تجویز کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ چوں کہ ایسے موقع پر شیرینی پیش کرنے کا دستور ہے، لہٰذا ڈھائی سو روپے کی ہنڈی بہ تقریب شیرینی اس خط میں ملفوف پہنچتی ہے۔ براہ کرم اسے قبول فرمائیں اور اس کے پہنچنے کی اطلاع بخشیں اور اس مخلص کو اپنا خیر اندیش تصور کرتے ہوئے اپنی خیریت کی خبر سے جلد جلد، عبارتِ سلیس میں، جس کے سمجھنے میں تکلف نہ ہو، مسرور و مطمئن فرماتے رہا کریں۔''[45]

لب و لہجے کے اعتبار سے یہ خط دنیائے ادب میں بے مثال ہے جس میں کسی والی ریاست نے ایک شاعر سے نیاز مندی کے حصول کے لیے بے مثال عجز و انکسار کا مظاہرہ کیا ہے۔[46]

غالب کے مکتوب میں ناظم کے نام معلوم مکاتیب میں سے صرف دو فارسی میں اور بقیہ

تمام اردو میں ہیں۔ بعض مکاتیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء یعنی جنگِ آزادی سے قبل لکھے گئے تھے لیکن غالب کی ہدایت پر نواب صاحب نے انھیں سیاسی مصالح کی بنا پر تلف کر دیا تھا۔ اردو میں لکھے گئے ابتدائی چند خطوط میں غالب نے نواب صاحب سے جو اندازِ تخاطب اختیار کیا تھا وہ بڑی حد تک پُر تکلف بلکہ مؤدب ہے لیکن دیکھا جا سکتا ہے کہ بعد کے مکاتیب میں اگرچہ غالب نے ایک والئ ریاست کے لیے حفظِ مراتب کا لحاظ ضرور رکھا مگر ایک نوع کی بے تکلفی بلکہ بعض مقامات پر ناز بے جا کی کیفیت بھی نمایاں ہے۔ اس بابت مالک رام نے اپنے مضمون میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔[47]

متذکرہ دستاویز میں غالب کا لہجہ اسی نیاز مندی کا مظہر ہے جو اردو میں لکھے گئے اس اولین مکتوب سے ظاہر ہوتا جو کہ تخلص کی بابت لکھا گیا تھا۔[48]

اس کے علاوہ ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس دست نوشتہ تحریر کے ذیل میں متذکرہ بالا مطبوعہ اصلاحات پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ غالب کی دستیاب اصلاحوں میں سے کلامِ ناظم پر غالب کی یہ تصحیح اب سے پہلے منظر عام پر نہیں آئی ہے۔[49] یعنی کلامِ ناظم پر غالب کی یہ اصلاح اب تک غیر مطبوعہ تھی۔

اس تحریر کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ کلامِ ناظم پر غالب کی یہ اصلاح رشتۂ تلمذ استوار ہونے کے بالکل ابتدائی دنوں کی معلوم ہوتی ہے بلکہ شاید یہ کلامِ ناظم پر غالب کی پہلی ہی اصلاح ہو۔

اس خیال کو تقویت اس طرح ملتی ہے کہ کاغذ پر درج پہلی غزل (جوٗ کی احتیاطؔ کی ردیف میں ہے) کے مقطع میں کاتب نے تخلص کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے بلکہ مقطعے میں مصرعۂ ثانی کو غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے کہ پہلے ''ناظم'' لکھا گیا اور پھر اسے مٹایا گیا ہے۔ یہی صورت بطور سرنامہ درج مصرع میں بھی ہے؛ ع : ناظم ایسا کہاں سے آیا خط۔ جہاں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ پہلے ''ناظم'' لکھا گیا تھا اور بعد میں مٹا دیا گیا اور مٹا مٹا سا لفظ ''ناظم'' پڑھا بھی جا سکتا ہے۔ شاید اشعار کی کتابت کے بعد غالب کو خیال آیا ہو کہ ابھی تو انھوں نے دیگر ناموں کے ساتھ تخلص بھی ''ناظم'' تجویز ہی کیا ہے، نواب صاحب کے مزاج کو نہ معلوم کون سا تخلص پسند

آئے۔شاید غالب کو اپنا یہ فیصلہ کن انداز حد ادب کے منافی بھی محسوس ہوا ہو۔اسی لیے تخلص مٹا دیا۔اسی لیے یہ گمان قوی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی اولین اشعار ہیں جو کہ ناظم نے غالب کو ۵؍فروری ۱۸۵۷ء کو فارسی زبان میں تحریر کیے گئے اپنے مکتوب کے ساتھ رشتۂ شاگردی استوار کرتے ہوئے بغرض اصلاح ارسال کیے تھے۔[۵۰]

(ششماہی غالب،ادارہ یادگار غالب کراچی،شمارہ ۲۱،۲۰۱۳ء،ص ۲۷۔۴۰)

حواشی

۱۔ مالک رام،تلامذۂ غالب (ترمیم واضافہ شدہ اشاعت)،۲۰۰۸ء،ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ص۵۵۷
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضاً،ص۵۶۷ نیز دیوانِ ناظم،ص۲۴۳۔(ناظم، یوسف علی خان، دیوان،۱۲۷۸ھ،مطبوعہ مطبع حسینی،رام پور)
۷۔ غالب،کلیاتِ فارسی،۱۹۲۵ء،نول کشور،ص۲۶۔۲۷
۸۔ تلامذۂ غالب،ص۵۶۷
۹۔ ایضاً
۱۰۔ مکاتیبِ غالب،(مرتبہ)امتیاز علی خان عرشی،۱۹۳۸ء،بمبئی،ص۴،حاشیہ
۱۱۔ ایضاً،ص۴(یہ پہلا خط وہی ہے جس کے بعد نواب صاحب کی شان میں قصیدہ بزبانِ فارسی ارسال کیا گیا تھا۔مذکورہ خط میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے توسط کا تذکرہ بھی ہے)۔
۱۲۔ مالک رام،"غالب اور دربار رام پور"مشمولہ:"غالب نام آور"،۱۹۶۹ء،انجمن ترقی اردو،کراچی ،ص۱۳۳
۱۳۔ امیر مینائی،"انتخاب یادگار"،۱۲۹۷ھ،تاج المطابع،ص۷۰
۱۴۔ غالبِ نام آور،ص۱۳۳
۱۵۔ مکاتیب غالب،ص۴
۱۶۔ غالبِ نام آور،ص۱۳۳
۱۷۔ تلامذۂ غالب،ص۵۵۸
۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ انتخابِ یادگار، ص۰۷۔۱۷

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ تلامذۂ غالب، ص۵۹۷

۲۲۔ انتخابِ یادگار، ص۰۷۔۱۷

۲۳۔ کسریٰ منہاس، غالب کی اصلاحیں، مشمولہ: 'نقوش' غالب نمبر، شمارہ ۱۱۱، اپریل ۱۹۶۹ء، لاہور، ص ۲۲۲

۲۴۔ ایضاً، ص۲۲۳

۲۵۔ خلیق انجم، (مرتب) ''غالب کے خطوط''، جلد سوم، ۱۹۹۸ء، انجمن ترقی اردو پاکستان، ص۱۱۷۹ تا ۱۲۰۴

۲۶۔ ایضاً، ۱۱۷۹

۲۷۔ عرشی، امتیاز علی خاں، ''مکاتیبِ غالب''، ص۸ (حاشیہ نمبر۱)

۲۸۔ ''انگشت نمبر'' کے الفاظ تقریباً ناخافا ہیں۔ قیاساً لکھے گئے ہیں اور یہ عبارت بظاہر دربار رام پور کے دفتری عملے کی طرف سے اضافہ ہے۔

۲۹۔ دیوانِ ناظم کے صفحہ نمبر ۹۰۔۹۱ پر نو اشعار کی غزل موجود ہے۔ ناظم، یوسف علی خان، دیوان، ۱۲۷۸ھ، مطبوعہ مطبع حسینی، رام پور

۳۰۔ ایضاً، یہاں گھائل لکھ کر کاٹ دیا گیا ہے اور بسمل تحریر کیا گیا ہے جب کہ دیوان میں یہ شعر ترتیب میں چوتھے نمبر پر ہے۔

۳۱۔ ایضاً (دیوان میں یہ شعر ترتیب میں دوسرے نمبر پر ہے)۔

۳۲۔ ایضاً 'ہلاک' سے پہلے تخلص لکھ کے مٹا دیا گیا ہے لیکن دیوان میں تخلص ناظم ہی ہے۔

۳۳۔ ایضاً، ص۹۱

۳۴۔ ایضاً، ص۸۹۔۹۰

۳۵۔ ایضاً (نچلا: مسودے میں یہ املا درج ہے)۔

۳۶۔ اس مضمون میں اشعار اور اصلاح کی عبارت کے اندراج میں جدید املا کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۳۷۔ صفدر مرزا پوری، مشاطۂ سخن معروف بہ شمع سخن وری، ۱۹۹۸ء، سورج پبلی کیشنز، ص۵۸ (یہ اشعار

دیوانِ ناظم کے صفحہ نمبر ۱۴ پر درج ہیں)

۳۸۔ بلوچ، سہیل عباس خان، ڈاکٹر، اردو شاعری میں اصلاحِ سخن کی روایت، ۲۰۰۸ء، مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور، ص۲۹۲

۳۹۔ دیوانِ ناظم، ص۱۲۲ نیز کسریٰ منہاس، ص۲۱۶

۴۰۔ ایضاً، ص۸۸ نیز کسریٰ منہاس، ص۲۱۶

۴۱۔ ایضاً، ص۱۵۵ نیز کسریٰ منہاس، ص۲۱۶

۴۲۔ ایضاً، ص۱۶۳

۴۳۔ ایضاً، ص۱۰۸

۴۴۔ کسریٰ منہاس، ص۲۱۷

۴۵۔ غالب اور دربارِ رام پور، مالک رام، ص۱۳۳۔۱۳۴۔ اصل فارسی مکتوب ''مکاتیبِ غالب'' مرتبہ: امتیاز علی خان عرشی میں موجود ہے۔

۴۶۔ ایضاً، ص۱۳۴

۴۷۔ ایضاً، ص۱۳۳ تا ۱۶۷

۴۸۔ غالب کے خطوط، جلد سوم، ص۱۱۷۹

۴۹۔ غالب کی اصلاحیں جن کتابوں میں نظر آئیں ان میں ''دستور الاصلاح''، ''مشاطۂ سخن'' کے علاوہ ''غالب کی اصلاحیں'' نامی مضمون اہم ہیں۔ ان میں سے کسی تصنیف میں مذکورہ بالا اصلاح کا تذکرہ نہیں ملتا۔

۵۰۔ مکاتیب غالب، ص۴

کتابیات

☆ امیر مینائی، ''انتخابِ یادگار''، ۱۲۹۷ھ، تاج المطابع

☆ بلوچ، سہیل عباس خان، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، ''اردو شاعری میں اصلاحِ سخن کی روایت''، مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور

☆ سیماب اکبر آبادی، ''دستور الاصلاح''، ۱۹۵۹ء، مکتبۂ پرچم، کراچی

☆ صفدر مرزاپوری، مشاطۂ سخن معروف بہ شمع سخن وری، ۱۹۹۸ء، سورج پبلی کیشنز

☆ غالب کے خطوط، مرتب: خلیق انجم، جلد سوم، ۱۹۹۸ء، انجمن ترقی اردو پاکستان غالب، کلیاتِ فارسی، ۱۹۲۵ء، نول کشور

☆ غالب، مکاتیبِ غالب، مرتبہ: امتیاز علی خان عرشی، ۱۹۳۸ء، بمبئ

☆ کسریٰ منہاس، غالب کی اصلاحیں، مشمولہ: ''نقوش غالب نمبر''، شمارہ ۱۱۱، اپریل ۱۹۶۹ء، لاہور

☆ مالک رام، تلامذۂ غالب (ترمیم و اضافہ شدہ اشاعت) ۲۰۰۸ء، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی

☆ مالک رام، ''غالب اور دربار رام پور'' مشمولہ ''غالب نام آور''، ۱۹۶۹ء، انجمن ترقی اردو، کراچی

☆ ناظم، یوسف علی خان، ''دیوان''، ۱۲۷۸ھ، مطبوعہ مطبع حسینی، رام پور